Registered No. L. 4186

جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ　　　　جلد ۱۲—عدد ۵

۷۸۶

ماہ نامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دار الاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

قیمت سالانہ پانچ روپے　　　　قیمت فی پرچہ ۸ آنے

قواعد

رسالہ ترجمانُ القرآن بالعموم ہر ہجری مہینہ کے آخری ہفتہ میں شائع ہُوا کریگا۔ دوسرے مہینہ کے پہلے ہفتہ تک اگر کسی خریدار کو پرچہ نہ پہنچے تو بروقت اُن کو شکایت کرنی چاہیئے۔

رسالہ کی قیمت میں رعایت ممکن نہیں ہے۔

خریداروں کو دفتر سے مراسلت کرتے وقت نمبر خریداری کا حوالہ ضرور دینا چاہیئے۔ جو حضرات نمبر درج نہ کریں گے۔ اُن کی شکایات پر کوئی توجہ نہ کی جائے گی۔

جن معاملات کا تعلق دفتر سے ہے اُن میں ایڈیٹر کو مخاطب نہ کیا جائے۔

منیجر

نرخنامہ و قواعد اِشتہار

مقدار	ایک ماہ	۳ ماہ	۶ ماہ	ایک سال
ایک صفحہ	عـنا ۱۰	عـعـه ۲۵	للعـه ۴۵	لـــه
نصف صفحہ	۶ ے	عـه ۱۵	عـعـه ۲۵	للعـه ۴۵
رُبع صفحہ	للعـه ۴	عـنا ۱۰	معـه ۱۷	عـعـه ۲۵

۱ - کوئی خلافِ شریعت یا خلافِ تہذیبُ اخلاق اِشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

۲ - اشتہار کی اشاعت سے پہلے اُجرت پیشگی وصُول ہونی ضرُوری ہے۔

۳ - صِرف وہی چربے قبول کیے جائیں گے جو اس رسالہ کے مسطر کے مطابق ہوں

۴ - نرخنامہ میں کوئی ترمیم نہ کی جائے گی۔

۵ - ٹائیٹل کے صفحات پر کوئی بیرونی اِشتہار شائع نہ کیا جائے گا۔

فہرستِ مضامین

ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ - مطابق جولائی ۱۹۳۸ء - جلد ۱۲ - عدد ۵

باہتمام چودھری نیاز علی خان صاحب پرنٹر و پبلشر، گیلانی الکٹرک پریس لاہور
میں طبع ہو کر دارالاسلام (نزد پٹھان کوٹ) سے شائع ہوا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

ادارۂ دار الاسلام کے کتبخانے کو کتابوں کا سب سے پہلا عطیہ ملک عبدالعزیز ابن سعود سلطان نجد و حجاز کی طرف سے وصول ہوا ہے جو مذہب حنبلی کی چند بہترین کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس عطیہ کیلیے ہم سلطان موصوف کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ عطایا کی فہرست شایع کرنا، اور معطیوں کے شکریے اشتہار کی صورت میں ادا کرنا ہمارے مسلک کے بالکل خلاف ہے، لیکن خاص طور پر اس عطیے کا ذکر ان صفحات میں اسلیے کیا جا رہا ہے کہ ہم اپنے ہمدردوں کو بھی اس مسرت میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اس ادارے کے کارنامے ابھی کچھ نہ سہی، مگر اس کا بنیادی تخیل ایسا ضرور ہے کہ اس نے اول یوم پیدائش ہی میں بیرونِ ہند کے سلاطین اسلام میں سے ایک کی توجہ اپنی طرف جذب کر لی، فالحمد للہ علی ذالك۔

اکثر اصحاب ادارۂ "دار الاسلام" کے دستور العمل کا بے چینی کے ساتھ مطالبہ کر رہے ہیں، اور اس مطالبہ میں شدت اس لیے پیدا ہو گئی کہ غلطی سے "پراسپکٹس" کی اشاعت کا اعلان قبل از وقت کر دیا گیا۔ وقت کی تنگی اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے دردمندانِ ملت کی بے چینی بالکل حق بجانب ہے۔ لیکن ہم مجبور ہیں کہ دستور العمل کی ترتیب میں جلد بازی سے اجتناب کریں۔ جہاں تک اس ادارے یا تحریک

سے کے بنیادی تخیل اور اسکے نصب العین اور طریق کار کا تعلق ہے، اسکا ایک مجمل خاکہ اُس مضمون میں دیا جاچکا ہے جو شوال ۵۶ھ کے "ترجمان القرآن" میں شائع ہوا تھا۔ (اسکو اب ایک پمفلٹ کی صورت میں بھی شائع کردیا گیا ہے) ۔ اب رہ گئیں تفصیلات تو ان کو مرتب کرنے کیلیے ضروری ہے کہ ہم اپنے حالات کا پوری طرح جائزہ لے کر اس امر کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرلیں کہ کسقدر ذرائع ہماری دسترس میں ہیں اور کتنی قوت ہمکو حاصل ہے۔ اس اندازہ کے بغیر کوئی اسکیم مرتب اور شائع کردینا ایک غیر آل اندیشانہ فعل ہوگا۔ لہذا ہم اپنے ہمدردوں سے درخواست کرتے ہیں کہ چندے توقف فرمائیں۔ جونہی دستور العمل شائع ہوگا، ترجمان القرآن میں اسکا اعلان کردیا جائیگا۔

بعض حضرات اس ادارہ کے نام پر معترض ہیں۔ وہ اس نام کا فقہی تصور ذہن میں رکھ کر اعتراض کرتے ہیں کہ جو مقام ایک غیر مسلم حکومت کے زیر تصرف ہے اور جہاں اقامت حدود اور تنفیذ احکام کا کوئی اختیار ہم کو حاصل نہیں، اسے "دار الاسلام" کیسے کہا جاسکتا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مقامی دار الاسلام نہیں ہے بلکہ مقصدی دار الاسلام ہے، یعنی اس ادارے یا اس تحریک کا نصب العین ہندوستان کو از سر نو دار الاسلام بنانا، اور نوجوانان اسلام کو علم، سیرت اور اسپرٹ کے اعتبار سے اس نصب العین کیلیے تیار کرنا ہے۔ اسی لیے اس کا نام ایسا تجویز کیا گیا ہے جو بالکل واضح طور پر اسکے مقصد کو ظاہر کرتا ہے۔ اس نام کے معنی یہ نہیں ہیں کہ دار الاسلام بالفعل بن چکا ہے، بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم دار الاسلام بنانے کا عزم رکھتے ہیں۔ جب کوئی جماعت اپنے آپ کو سوراج پارٹی یا ہوم رول لیگ یا نیشنل کانگریس کہتی ہے تو اسکے معنی یہ نہیں ہوتے کہ سوراج بالفعل حاصل ہوچکا ہے، یا ہوم رول عملاً قائم ہوچکا ہے، یا نیشن فی الواقع بن چکی ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس جماعت کا مقصد یہ ہے اور اسکی جدوجہد اس نصب العین کیلیے ہے۔

پھر اس خاص جگہ کو جہاں یہ ادارہ قائم ہے "دار الاسلام" کے نام سے موسوم کرنے کی علت بھی یہی ہے۔ جس طرح ایک عمارت کو "سوراج بھون" کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہاں عملاً سوراج قائم ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سوراج کی تحریک اس مرکز سے چلتی ہے، اس طرح تحریک دار الاسلام کے مرکز کو عین دار الاسلام کہنے کا مطلب بھی اسکے سوا کچھ نہیں کہ یہ اس تحریک کا مرکز عصبی (Nerve centre) ہے۔ اس نقطہ سے دار الاسلام وجود میں آنا شروع ہوتا ہے۔ یہاں ہم کسی غیر مسلم کی سیادت اور کسی غیر اسلامی قانون کی حکمرانی تسلیم نہیں کرتے الا یہ کہ وہ ہم پر بجبر مسلط ہو جائے۔ ہم انقیاد (Submission.) کیلیے تیار نہیں۔ البتہ قاہرانہ غلبہ (Subjugation.) کو ارادۂ دفع اور عزم مقابلہ کیساتھ مجبوراً گوارا کرتے ہیں۔

امید ہے کہ اس توضیح کے بعد ان لوگوں کا اطمینان ہو جائیگا جو نیک نیتی کیساتھ اس نام کی معنویت سمجھنا چاہتے ہیں۔ رہے وہ حضرات جنکے دلوں میں بیماری ہے، تو ان کی تشفی کسی معقول بات سے نہیں ہو سکتی۔ وہ بدخواہی اور بدگوئی ہی سے اپنے دلوں کی آگ بجھانے کی کوشش کرتے رہینگے اور یہ چیز اپنی طبعی خاصیت کی بنا پر اس آگ کو اور زیادہ بھڑکاتی چلی جائیگی۔ ہمارے پاس ان کے لیے کوئی دوا نہیں۔ صرف یہ دعا ہے کہ شافی مطلق انکے دل کو اچھا کردے۔

ادھر کچھ عرصہ سے ترجمان القرآن کے صفحات میں اُن علمائے کرام کی سیاسی پالیسی پر تنقید کی جاتی رہی ہے جو عامۂ مسلمین میں کانگریس کی تحریک رابطۂ عوام (Mass Contact) کو پھیلانے کی کوشش کر رہے ہیں چونکہ ہمارے نزدیک ان کی یہ سیاست اصول اسلام کے خلاف اور مسلمانانِ ہند کی قومی ہستی کیلیے مہلک ہے، اس لیے ہم نے ان حضرات کو انکی غلطی پر متنبہ کرنا اپنا دینی فرض سمجھا، اور اس فرض کو ادا کیا۔ اس تمام بحث میں ہماری مخاطب پوری جماعت علماء نہیں، بلکہ صرف

وہ جماعت رہی ہے جو مذکورۂ بالا سیاسی پالیسی پر عامل ہے۔ پھر اس خاص جماعت کے بھی اخلاق یا اعمال پر ہم نے کوئی عام حرف گیری نہیں کی بلکہ تمام بحث کو صرف اس خاص مسئلہ تک محدود رکھا جو ہمارے اور انکے درمیان مختلف فیہ ہے۔ اور اس خاص مسئلہ میں بھی ہم نے ان کی نیت پر کبھی کوئی حملہ نہیں کیا بلکہ محض دلائل سے انکی غلطی ثابت کرنے کی کوشش کی اور اسکے جو کچھ نتائج ہمارے نزدیک مسلمانانِ ہند کے مستقبل پر مترتب ہونے والے ہیں انکو صاف صاف بیان کر دیا۔ اسکے ساتھ ہی ہم نے انکو بار بار دعوت دی کہ یا تو اپنی غلطی تسلیم کر کے اس سے رجوع فرمائیے، یا کم از کم یہی بتا دیجیے کہ آپ کن عقلی و نقلی دلائل سے اس پالیسی کو صحیح سمجھتے ہیں۔ ہمارے اس طرزِ عمل سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارا مقصد علماء کے اس گروہ کو مقامِ اعتبار و احترام سے گرانا نہیں بلکہ ایک قومی مسئلہ میں اختلاف کو رفع کرنا ہے، اور اگر وہ حقیقت میں غلطی کر رہے ہیں تو مسلمانوں کو انکی غلطی کے نتائج سے اور خود انکو دنیا کی ناکامی اور آخرت کی بازپرس سے بچانا ہے۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ علماء کے اس گروہ پر ہماری اس خیر خواہانہ کوشش کا الٹا اثر ہو رہا ہے۔ وہ اس کو عناد اور دشمنی پر محمول کر رہے ہیں۔ اس کو یہ معنی پہنا رہے ہیں کہ مدیر ترجمان القرآن علماء کی عزت پر حملہ کر رہا ہے۔ اور انکی جانب سے نہ صرف ترجمان القرآن کی ذات کے خلاف، بلکہ ادارۂ دار الاسلام کے خلاف بھی جھوٹے پروپیگنڈا کے وہ طریقے اختیار کیے جا رہے ہیں جو اس ناخدا شناسی اور آخرت فراموشی کے دور میں عموماً سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے کے خلاف استعمال کیا کرتی ہیں۔

میں اس قسم کے پروپیگنڈا کا جواب دینے سے بالکل قاصر ہوں، اور ایسی لڑائی میں اعترافِ شکست ہی میرے نزدیک شریف آدمی کیلیے اخلاقی فتح ہے، اسلیے میں کوئی جواب تو دینا نہیں چاہتا، البتہ ان حضرات کو چند نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں کہ الدین النصیحۃ۔

بدقسمتی سے سیاسیات کے مشغلہ نے یہ بات انکے دل سے بھلادی ہے کہ وہ علمائے اسلام ہیں اور ان کا منصب دینِ مقدس اسلام کی نمائندگی کا منصب ہے۔ وہ اپنے آپ کو محض ایک سیاسی پارٹی سمجھنے لگے ہیں اور ذہنی و اخلاقی حیثیت سے عام پارٹیوں کے مقام پر اتر آئے ہیں، اس لیے ان کا گمان یہ ہے کہ جسطرح ہر پارٹی پبلک میں اپنے نفوذ واثر کی حفاظت کرنے اور مخالف پارٹیوں کو گرانے کے لیے تمام ممکن طریقے اختیار کرنے کی آزادی رکھتی ہے اسی طرح وہ بھی اس معاملہ میں آزاد ہیں۔ حالانکہ فی الواقع ایسا نہیں ہے۔ آجکل کی سیاسیات میں تو دیانت اور اخلاق کوئی چیز نہیں۔ صداقت ایک لفظ بے معنی ہے۔ کامیابی کا معیار آخرت نہیں بلکہ دنیا ہے۔ اسلیے سیاسی لوگ اپنے مخالفین کو جھوٹ کی طاقتوں سے گرانا بالکل جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے اخلاق میں یہ بالکل درست ہے کہ ہر وہ بات تصنیف اور شائع کر دی جائے جو پبلک کو فریقِ مقابل سے بدگمان کر سکتی ہو، قطع نظر اسکے کہ اسکی کوئی حقیقت ہو یا نہ ہو۔ لیکن علماء جس مذہب کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں اسکے اصول اخلاق یہ نہیں ہیں۔ وہ تو یہ تعلیم دیتا ہے کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَنْ لَّا تَعْدِلُوا اعْدِلُوا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (کسی قوم کی دشمنی تم کو ایسا کشتہ نہ بنادے کہ تم انصاف سے روگردانی کرو۔ نہیں، انصاف کرو کہ یہی شیوہ پرہیزگاری سے قریب تر ہے) اور كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنْفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ (راستی پر سختی کے ساتھ قائم رہو اور خدا کی خاطر گواہی دو چاہے وہ تمہاری اپنی ذات یا تمہارے ماں باپ یا قرابت داروں ہی کے خلاف پڑتی ہو)۔ لہذا اگر آپ کا کسی سے باپ مارے کا بیر بھی ہو، اور آپ کسی کے خون کے بھی پیاسے ہوں، تب بھی آپ کیلیے جائز نہیں کہ جھوٹ کے ہتھیار اسکے خلاف استعمال کریں۔ ان طریقوں سے آپ اپنے وقار کی حفاظت فرمائینگے تو رہا سہا وقار بھی کھو بیٹھینگے۔

یہ ایک افسوسناک بات ہے کہ جب کسی مسئلے میں کسی عالم دین یا کسی گروہ علماء کی رائے پر تنقید کی جائے یا ان سے حجت پوچھی جائے تو وہ خود یا انکی جماعت کے لوگ اسکا معقول جواب دینے کے بجائے علماء کے وقار کا سوال چھیڑ دیں، اور تمام بحث اصل مسئلے سے ہٹا کر اس ڈھنگ پر شروع کر دیں کہ فلاں شخص علماء کے وقار کو صدمہ پہنچا رہا ہے، اور علماء کے وقار کو صدمہ پہنچانیکے معنی یہ ہیں کہ مسلمانوں کا اعتماد اُن پر سے اُٹھ جائے، اور جب مسلمان ان پر اعتماد نہ کرینگے تو گمراہ ہونگے، لہذا وہ مردود در اصل مسلمانوں کو بے دین بنانا چاہتا ہے اور مزدور ہے کہ اعدائے دین کے تمام گروہوں سے اسکا کوئی نہ کوئی رشتہ ہو۔

میں علماء کو یاد دلانا چاہتا ہوں کہ وقار (Prestige.) کا یہ تصور سراسر غیر اسلامی ہے اور اس وقار کو بچانے کا یہ طریقہ اس سے بھی زیادہ غیر اسلامی۔ مسلمان کا وقار دنیا پرستوں کی طرح غیر حق پر قائم نہیں ہوتا کہ تنقید سے اسکو صدمہ پہنچنے کا خوف ہو اور وہ ناقدوں کے منہ بند کرتا پھرے۔ اس کے وقار کی بنیاد حق کے سوا کسی دوسری چیز پر نہیں ہوتی، اسلیے وہ تنقید سے ڈرتا نہیں بلکہ اپنے آپ کو برملا تنقید کیلیے پیش کرتا ہے، اور حجت سے اپنا برسر حق ہونا ثابت کر دیتا ہے۔ اسکے وقار کو تو اس وقت بھی صدمہ نہیں پہنچتا جب وہ امیر قوم کی حیثیت سے منبر پر کھڑا ہو اور ایک معمولی آدمی اٹھ کر اس سے پوچھے کہ یہ چادر تو کہاں سے لایا؟ وہ اس محاسبہ پر جھنجھلانے کے بجائے اسکا جواب دیتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک جس شخص کا حساب بے باق ہو اس کو محاسبے سے باک نہ ہونا چاہیے اور جسکا وقار محاسبہ کی چوٹ پڑتے ہی ٹوٹ پھوٹ جائے اسکے وقار کا ٹوٹ جانا ہی اچھا۔ یہی نہیں بلکہ مسلمان کو علانیہ پبلک میں ایک معمولی بڑھیا کے سامنے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے بھی وقار کے کھوئے جانے کا خوف نہیں ہوتا کیونکہ وہ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے نزدیک غلطی پر قائم رہ کر آخرت میں اپنا وقار کھونے سے یہ لاکھ درجہ بہتر ہے کہ غلطی مان کر دنیا میں وقار کھو دیا جائے۔

پس علماء کے اسلامی وقار کو صدمہ اس سے نہیں پہنچ سکتا کہ ان کے کسی قول یا فعل پر تنقید کی جائے یا کسی بات پر ان سے حجت طلب کی جائے، بلکہ اس کو دراصل صدمہ اس سے پہنچتا ہے کہ وہ تنقید پر بپھر جائیں، حجت کا جواب حجت سے دینے کی ہمت نہ کریں اور مقابل کا منہ اُن تدبیروں سے بند کرنے کی کوشش کریں جن پر اِنَّ کَیْدَکُنَّ عَظِیْمٌ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

اگر خدانخواستہ علماء کا وقار اب ایسا ہی ہو گیا ہے کہ وہ تنقید اور طلب حجت سے مٹ جاتا ہے، اور غیر مشروع چالوں کے سوا کسی دوسرے طریقہ سے اسکی حفاظت نہیں ہوسکتی تو وہ آج نہیں، کل مٹ کر رہیگا اور اسکے مٹنے سے اسلام کا ہرگز کوئی نقصان نہ ہوگا۔

علماء کی عزت بلاشبہ ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اگر ان کی عزت نہ ہو، ان کا اعتماد نہ ہو تو مسلمان اپنے دین کا علم کس سے حاصل کرینگے؟ احکام دین کس سے پوچھینگے؟ عبادات اور معاملات میں کس کا اتباع کرینگے؟ اس لحاظ سے علماء کے وقار اور اسکے اعتماد کی حفاظت، درحقیقت دین کی حفاظت ہے، اور اس چیز کے ضائع ہو جانے سے مسلمانوں کے گمراہی میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ یقینی ہے۔

لیکن یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ اسلام میں علماء کی حیثیت وہ نہیں ہے جو ہندوؤں میں برہمنوں کی اور کلیسا میں پوپ اور اسکے گروہ اساقفہ کی ہے۔ علماء اسلام جو کچھ اسلام کی طرف سے کہیں اور کتاب وسنت کی حجت پر کہیں وہی لائق اتباع ہے۔ انکی جو کچھ بھی مرتبت ہے اسی اس بنا پر ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کی نمائندگی کرتے ہیں۔ ورنہ اس حیثیت سے ہٹ کر ان میں اور عام انسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ اگر وہ اپنی شخصی رائے سے کوئی طریقہ اختیار کریں تو انہیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ مسلمانوں کو اس طریقہ کی طرف کھینچنے کیلئے اپنے دینی وقار سے کام لیں، اور اس خاص مسئلے میں جو شخص انکی مخالفت کرے اس پر یہ الزام لگائیں کہ یہ شخص

"علمائے اسلام" کا مخالف ہے اسلیے نفس اسلام کا دشمن ہے۔ یہی نہیں، بلکہ اگر وہ اصول اسلام کے خلاف عمل کریں اور یہ ثابت نہ کرسکیں کہ ان کا عمل اصول اسلام کے خلاف نہیں ہے، تو "علمائے اسلام" ہونے کی حیثیت سے ان کا مسلمانوں پر کوئی حق باقی ہی نہیں رہتا۔ بخلاف اسکے براہمہ اور اساقفہ اس امر کے مدعی ہیں کہ ہم بجائے خود ایک مقدس گروہ ہیں، مجرّد برہمن یا اسقف ہونے ہی کی بنا پر ہمیں یہ حق پہنچتا ہے کہ ہمیں عام انسانوں سے بالاتر سمجھا جائے، ہمارے آگے سر جھکایا جائے اور یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حق ہر حال میں ہمارے ساتھ ساتھ گردش کرتا ہے۔

اس اصولی فرق کو نظر انداز کرکے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ فلاں فلاں اصحاب "ہمارے اکابر" ہیں اسلیے ان کے ارشادات پر حجت کا سوال کرنا ہی گستاخی ہے، جو کچھ انکی زبان سے نکلے، وہی عینِ حق ہے، جس طرف وہ جائیں اسی طرف آنکھیں بند کرکے چلنا چاہیے، اور یہ کلّی مفروضہ اپنے دل میں بٹھا لینا چاہیے کہ وہ اور اسلام متحد الحقیقت ہیں اور خطا کا صدور ان سے مستبعد ہے، وہ دراصل اسلام میں برہمنیت اور پاپائیت کی بنیاد رکھ رہے ہیں۔

اس طور پر علماء کے وقار کی حفاظت کرنا اسلام کیلیے اتنا ہی نقصان دہ ہے جتنا علماء کو من حیث الجماعت ساقط الاعتبار کردینے کی کوشش کرنا۔ عدل و توسط کی راہ سے یہ دونوں طریقے بالکل ہٹے ہوئے ہیں، اور سچے علماء کا فرض ہے کہ جس طرح وہ دوسرے طریقے کی مخالفت کرتے ہیں اسی طرح پہلے طریقہ کی بھی مخالفت کریں، یا کم از کم اسکی ہمت افزائی تو نہ کریں۔ اس میں شک نہیں کہ ایسے معتقدوں کے افعال و اقوال نفس کیلیے بہت لذت بخش ہوتے ہیں، مگر تقویٰ کی تعریف یہی ہے کہ نفس کو خلافِ حق باتوں میں لذت لینے سے روکا جائے، اور یہ حق پرستی کی راہ میں جیل کی چکیاں پیسنے اور پولیس کی لاٹھیاں کھانے سے بھی زیادہ سخت مرحلہ ہے۔

اور یہ "ہمارے اکابر" کا تخیل بھی ایک فتنہ بن کر رہ گیا ہے۔ آدمی جس بزرگ کی تعلیم اور فیض صحبت سے مستفیض ہو اسکی عزت اور قدر و منزلت کرنا تو عین مقتضائے شرافت و انسانیت ہے۔ اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ معاملہ اس حد سے بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ مختلف علمی اور مذہبی حلقوں نے اپنے اپنے جتھے بنا لیے ہیں اور ان جتھوں میں سخت طائفی عصبیت پیدا ہو گئی ہے۔ ایک جتھے کا آدمی اور خصوصاً بڑا آدمی جو کچھ کہے یا کرے اس کا ساتھ دینا پورے جتھے پر فرض ہو جاتا ہے، اور اس معاملہ میں یہ دیکھنا جماعتی وفاداری کے بالکل خلاف سمجھا جاتا ہے کہ وہ بات بجائے خود حق ہے یا نہیں۔ اسی طرح اگر کسی جتھے کے اکابر یا ان میں سے کسی اکبر کی رائے پر تنقید کی جائے تو سارے جتھے میں حمیت جاہلیہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور اُس وقت یہ دیکھنا گویا حرام ہو جاتا ہے کہ ناقد نے جو کچھ کہا ہے وہ حق ہے یا نہیں۔ جذبات کا سارا اشتعال صرف اس بنیاد پر ہوتا ہے کہ اس نے ہمارے اکابر کی "توہین" (یعنی ان پر تنقید) کی ہے، اور اس جنگ میں "ہمارے اکابر" کا لفظ بطور ایک شعار جاہلیت کے استعمال کیا جاتا ہے جس طرح اسلام سے پہلے عرب میں قبیلوں کے نام یا آبا و اجداد کے نام پکارے جاتے تھے۔ پھر اگر حسن اتفاق سے اسی حلقے میں کچھ لوگ ایسے بھی نکل آئیں جو اس جتھے بندی میں شریک نہ ہوں اور ناقد کو حق بجانب دیکھ کر اسکی تائید کریں تو انکو اس حق پرستی پر الٹا مطعون کیا جاتا ہے اور اچھی خاصی ممتاز شخصیت کے آدمیوں کو بھی علی الاعلان یہ کہتے ہوئے ذرا حجاب نہیں ہوتا کہ فلاں صاحب کو "اپنے بزرگوں کی سچی عقیدت اس چکر سے نکال لیگی"، یعنی وہ حق پرستی کے چکر سے نکل کر حمیت جاہلیہ کے چکر میں پھنس جائینگے!

جو شخص علم دین میں کچھ بھی بہرہ رکھتا ہو اس سے یہ حقیقت چھپی نہیں رہ سکتی کہ اس قسم

کی جتھے بندی فطرتِ اسلام کے بالکل خلاف ہے۔ اسلام صرف ایک جتھے سے واقف ہے، اور اس جتھے کا نام "حزب اللہ" ہے۔ یہاں دوستی اور دشمنی، موافقت اور مخالفت جو کچھ ہے اللہ کیلئے ہے۔ مسلمان کی غایتِ زندگی یہی ہے کہ وہ مرضاتِ الٰہی کا اتباع کرے اور اسی پر دنیا و آخرت میں اس کی فلاح کا مدار ہے، اسلئے مسلمان ہونے کے ساتھ ہی اس پر یہ لازم ہوجاتا ہے کہ نفس کے تمام رجحانات اور ہوائے نفسانی کی ساری لگاوٹوں سے پاک ہوکر خالص علم کتاب اور عقل و وجدان کی روشنی میں یہ تحقیق کرے کہ رضائے الٰہی کس راستے میں ہے، اور جب کسی راستہ کے برحق ہونے پر اسکا قلب مطمئن ہوجائے تو اسی کا اتباع کرے بلا لحاظ اسکے کہ کون اس سے خوش ہوتا ہے اور کون ناراض۔ خود علم دین کی درس و تدریس کا منشا بھی اسکے سوا کچھ نہیں کہ طالب علم میں اسی تحقیق کی ضروری استعداد پیدا کردی جائے۔ اگر کوئی نظام تعلیم ایسا ہے جو علم حاصل کرنے والوں میں مرضاتِ الٰہی کی تحقیق اور اسکے اتباع کی صلاحیت اور اسپرٹ پیدا کرنے کے بجائے انکو اپنے اساتذہ اور اکابر کے گرد گھومنا سکھاتا ہے تو اسلامی نقطۂ نظر سے وہ اپنے اولین مقصد ہی میں ناکام ہے۔

آج استادوں اور بزرگوں کی سچی عقیدت کا جو معیار پیش کیا جارہا ہے وہ اس معیار سے کس قدر مختلف ہے جو کبھی امام ابو یوسف، امام محمدؒ، امام شافعی اور امام احمد ابن حنبل رحمہم اللہ نے پیش کیا تھا۔ ان کے استادوں سے بڑھکر کس کے استاد اکابر کہلائے جانیکے مستحق تھے، اور اُن سے بڑھکر کون اپنے اکابر کی عزت اور عقیدتمندی کا دعویٰ کرسکتا ہے مگر سب کو معلوم ہے کہ وہ اپنے علم اور اپنی عقل و وجدان کے مطابق جس چیز کو حق سمجھتے تھے، بے تکلف اس کا اتباع اور اظہار کرتے تھے خواہ انکی رائے استادوں کی رائے کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ انکے زمانے میں کوئی اس جتھے بندی سے واقف نہ تھا جو آج علم دین کے گہواروں میں پرورش پارہی ہے۔

یہ چند خیر خواہانہ مشورے کامل خلوص نیت کے ساتھ میں اُن علمائے کرام کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جو اس وقت جمعیت العلماء کی سیاسی اور اخباری پالیسی کو چلا رہے ہیں۔ میں یہ نہیں دیکھ سکتا کہ علمائے ہند کی مرکزی جماعت کے نام سے وہ باتیں کی جائیں جو اصول اسلام کے خلاف اور مبادی اخلاق کے منافی ہوں۔ میرے نزدیک اس میں علمائے دین اور انکے ساتھ تمام مسلمانوں اور خود اُس دین کی رسوائی ہے جس کی نمائندگی یہ حضرات کر رہے ہیں۔ اسلیے محض دین و ملت کے مفاد نے مجھ کو یہ چند الفاظ لکھنے پر مجبور کیا ہے، ورنہ جو خوش تمیزی میرے ساتھ کی جا رہی ہے اس کا جواب خاموشی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

چونکہ یہ ایک ضروری مسئلہ بیچ میں آگیا تھا اس لیے بحث کا وہ سلسلہ مجبوراً روکنا پڑا جو اشارات میں مسلسل چل رہا تھا۔ انشاء اللہ آئندہ پرچے میں اسکو مکمل کر دیا جائیگا۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابل ذکر ہے۔ الجمعیت میں جب مدیر ترجمان القرآن اور تحریک دار الاسلام پر مسلسل حملے شروع ہوئے تو منیجر ترجمان القرآن نے دفتر الجمعیت سے درخواست کی کہ ذیل کا اشتہار اپنے اخبار میں اُجرةً شائع فرما دیں:۔

"ناظرین الجمعیت کی انصاف پسندی سے ہم توقع رکھتے ہیں کہ وہ تصویر کا دوسرا رخ دیکھے بغیر کوئی رائے قائم کرنا پسند نہ کرینگے۔ لہذا جو حضرات دوسرا رخ دیکھنا چاہیں وہ رسالہ "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" مفت اور ترجمان القرآن کے دو پرچے جن کے مضامین پر نکتہ چینی کی گئی ہے نصف قیمت پر طلب فرمالیں"

اس کا جو جواب دفتر الجمعیت سے وصول ہوا وہ یہ تھا کہ اس اشتہار کو اجرت لیکر بھی شائع نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ خود اپنی پوزیشن کی کمزوری محسوس کرتے ہیں اور خوب جانتے ہیں کہ جس فریب میں یہ اپنے ناظرین کو مبتلا کر رہے ہیں اس کا پردہ چاک ہو جائیگا اگر دوسری جانب کے بیانات ان تک پہنچ جائینگے۔ یہ اخلاقی مرتبہ ہے ان لوگوں کا جو جمعیت علمائے ہند کے معزز نام سے اسوقت مسلمانوں میں کام کر رہے ہیں۔

طلبِ حجت کا جواب

جمعیت علمائے ہند کی جانب سے

[ان صفحات میں متعدد مرتبہ علمائے کرام کے اُس گروہ سے، جو کانگریس کی حمایت کر رہا ہے، درخواست کی گئی تھی کہ آپ کے پاس اپنے مسلک کی تائید میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ یا عقل سے اگر کوئی حجت ہے تو اسے پیش فرمائیے تاکہ ہمیں کم از کم یہ معلوم تو ہو کہ آپ کس بنیاد پر مسلمانوں کو اس طرف دعوت دے رہے ہیں، اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ حق آپ کے ساتھ ہے تو ہم بھی آپ کا اتباع کریں۔ اسکے ساتھ ہی انکے مسلک کے خلاف جو دلائل ہمارے پاس تھے ان کو بھی ہم نے کافی شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا تاکہ یا تو وہ اپنی غلطی کا اعتراف فرمائیں یا ہمارے دلائل کی غلطی ثابت فرما دیں۔

اس طلب حجت اور استدلال کا جو عالمانہ جواب جمعیۃ علمائے ہند کی جانب سے اسکے واحد ترجمان "الجمعیت" نے اپنی ۲۴ جولائی ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں عنایت فرمایا ہے اسے لفظ بلفظ یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ ہم یہ پسند نہیں کرتے کہ ناظرین ترجمان القرآن مقدمہ کے صرف ایک فریق کا بیان سن کر کوئی رائے قائم کریں۔ دوسرے فریق کا بیان بھی اجیسا کچھ اسکے وکیل پیش کریں، جوں کا توں پہنچا دینا ہمارا فرض ہے، چنانچہ یہ فرض ہم ادا کر رہے ہیں۔]

مودودی - خطبہ فروش - چالاک تاجر -

دنیا کی سیہ بختی کے آسمان پر ــــ دامان افق کی پستیوں کے قریب ــــ قادیانی تحریک

اَند خاکسار تحریک کی صورت میں ــــــ دو دمدار ستارے کچھ عرصہ قبل طلوع ہوئے اور طلوع ہوتے ہی خطِ ناکامی سے قریب ہو کر مغرب کی طرف ڈھلنے اور غروب ہونے کی تیاری میں ٹمٹمانے لگے۔

ان ہی ستاروں کے پہلو بہ پہلو ایک اور ستارہ طلوع ہوا۔ یہ ستارہ اپنے یوم ظہور ہی سے فضا کی بلندیوں میں ٹوٹتے ہوئے ستارے کی طرح شرارے جھاڑ رہا ہے اور تیزی سے پستی کی طرف اس طرح آرہا ہے کہ دور بین دنیا کو شکست سے پہلے اپنی شکست کی خبر دے رہا ہے۔ یہ ستارہ کون ہے؟ ــــ شیطان نہیں ایک انسان ہے ــــــ مودودی! مفکر مودودی؟ مفسر مودودی؟ مجتہد اور غیر مقلد مودودی؟ خطیب اور ادیب مودودی، سنجیدہ اور مہذب مودودی! ترجمان کا اڈیٹر۔ فہم قرآن کا مدعی اور اصلاح کا داعی ــــــ مودودی! اگر ستم ظریفی سے کام لیا جائے تو کہا جائیگا بہت ہی سنجیدہ مودودی۔ اتنا سنجیدہ جسکی سنجیدگی پر علامہ سلیمان ندوی کی شہادت اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی کی صورت میں موجود ہے جس پر "صدق" کے صادق و مصدق مدیر فاضل کی گواہی ثبت ہے جسکے حق میں "الفرقان" ایسے محبوب عوام اور منظور خواص، اسلامی، اصلاحی مجلہ کا فیصلہ ہے فیصلہ بھی کیسا۔ جسکے ساتھ ایمان کی تمام قوتیں ہیں ان قوتوں کا اصرار ہے اور ہر اصرار کے ساتھ ایک تازہ دم کمک چلی آرہی ہے۔ سبحان اللہ! صلِّ علیٰ! و اجرکم عند اللہ۔

بے نیاز ہوش، جوش ــــــــــــــــــ

مودودی صاحب حیدر آباد میں دار الترجمہ سرکار عالی میں قبول نہ کیے جا سکے[1] تو ان کی حاجتیں ایک عطار خانہ کی طرف منتقل ہو گئیں۔ جب ناکامی نے یہاں بھی سبز قدم دیکھے تو ترجمان القرآن[2] نکلا

[1] جواب دینا مقصود نہیں۔ مگر موٹی موٹی غلط بیانیوں کی اصلاح ناگزیر ہے۔ واقعہ صرف اسقدر ہے کہ اب بارہ برس پہلے جب میں "الجمعیت" کا ایڈیٹر تھا، مجھے دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ میں مترجم عربی مقرر کرنے کیلیے حضور نظام کا فرمان صادر ہوا تھا۔ مگر اس کے بعد مترجم عربی کی کوئی جگہ خالی نہیں ہوئی۔ رہی یہ بات کہ میں خود ملازمت کا کس قدر خواہشمند تھا تو جاننے والے جانتے ہیں کہ اگر میں اسکا طالب ہوتا تو حیدر آباد جیسی جگہ میں کیا حاصل نہ کر سکتا تھا (مودودی) بقیہ حاشیہ صفحہ ۵ پر ملاحظہ ہو

آغاز قابلِ اعتراض نہ تھا۔ مگر حیدر آباد کی سنجیدہ فضا اس کے انجام کی متحمل نہیں ہو سکتی تھی۔ اس لیے وہاں کے امراء نے مودودی صاحب کے گل واؤدی کو پانی دینا بند کر دیا[1]۔ یہ آرزوئیں پنجاب کے پانچ دریاؤں کی طرف متوجہ ہوئیں اور انہیں دریائے بیاس کے کنارے پیاس بجھانے کا موقع مل گیا۔

آئیوالا انقلاب مودودی صاحب کے سینہ میں خطرات کا مجسم شیطان بن گیا انھوں نے چند مضامین ہوش اور جوش کی منظم قوتوں سے امداد لے کر لکھے۔ اختلافِ خیال کے باوجود علماءِ حق کی جماعت نے ان کو برداشت کیا۔ مضامین سطحی منطق اور بعض پہلو سے فلسفیانہ تھے جنمیں جوشیلی خطابت کے تصنع سے اثر پیدا کیا جا رہا تھا۔ قدرتی بات ہے کہ جس بڑے دماغ میں علم کا ذخیرہ تھوڑا ہوتا ہے اسکے لیے کچھ عرصہ بعد مسلسل بحث سب سے بڑا ابتلا بنجاتی ہے آپ کا ذخیرہ ختم ہوا تو دماغ بھی خالی صراحی کی طرح آخری مرتبہ قُل قُل کرنے لگا۔

ہمیں معلوم تھا کہ جناب مودودی صاحب میں جوش ہے مگر وہ زیادہ عرصہ تک ہوش کا ساتھ نہیں دے سکیں گے تاہم انتظار کو ہم نے دلیل راہ بنا لیا اور سکوت کو جماعت کیلیے ذریعۂ نجات سمجھا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۲۴ - ۲ اس واقعہ کی اصلیت یہ ہے کہ ترجمان القرآن جاری کرنیکے بعد میں نے حیدر آباد میں ایک مخلص دوست کی شرکت سے ایک یونانی دواخانہ قائم کیا جس سے غرض یہ تھی کہ میں ترجمان القرآن کی آمدنی کو اپنی ذات پر خرچ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ الحمدللہ یہ دواخانہ اب تک حیدر آباد میں قائم ہے اور میرا اس کے ساتھ تعلق بھی قائم ہے۔ (مودودی)

[1] حیدر آباد میں سینکڑوں آدمی میرے حالات سے واقف ہیں اور انہیں معلوم ہے کہ یہ رسالہ کبھی کسی کی عنایات کا شرمندۂ احسان نہیں ہوا۔ رہی یہ بات کہ اس رسالہ کا حیدر آباد میں مقبول نہ ہونا میرے حیدر آباد سے منتقل ہونے کا سبب ہے، تو حیدر آباد میں جو کوئی اس کو پڑھے گا وہ حیران رہ جائیگا کہ دفتر جمعیت علماء ہند میں صداقت کا معیار کس قدر بلند ہے! (مودودی)

مودودی صاحب پنجاب پہنچے - پٹھان کوٹ کے قریب دار السلام کی بنیاد ڈالی گئی - روپوں کی بارش سے جو نہر پیدا ہوئی اسمیں ترجمان القرآن کی کاغذی ناؤ چلنے لگی اسلامی اور اصلاحی کاموں میں روپیہ کی ضرورت ہوتی ہے ہمیں بہت خوشی ہوئی، خوشی ہونی چاہیے تھی - اختلاف کتنا ہی قوی سہی - اسلام کا کام، پھر دار السلام کا قیام، مقصد تعمیری - مطمح نظر اصلاحی نصب العین امت کا اجتماع اور مسلمانوں کی تنظیم، ہم خود مسلمان، اسلام ہمارا مقصد، مسلمانوں کی ترقی و تنظیم ہماری تمام زندگی کا حاصل - اختلاف کیوں ہوتا - اور ہم کرتے تو کیوں مخالفت کرتے - مگر چند ہی دن گذرے تھے کہ پنجاب کی فضا راست آئی اور ترجمان کی بحث ونظر کا لباس "تن عریانی" بن کر رہ گیا - بارگاہ مودودی سے تمام فاسق وفاجر لوگوں کو معافی مل گئی - تمام گناہگاروں کی خطاپوشی کا اعلان ہوگیا - تمام زانیوں، شرابیوں، بدکاروں اور سیاستِ فرنگ کے تمام نازبرداروں کو دار السلام سے حکم مل گیا - ادخلوا فی السلم کافہ - (دار السلام میں سب کیلیے سلامتی ہے) مگر کمال یہ ہے کہ مولانا حسین احمد صاحب، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید کے گناہ ناقابل معافی ہیں - ان کی عاقبتیں خراب، ان کی نیتیں فاسد، ان کی تمام زندگی برباد اور ان کی آنے والی نسل ہندو دھرم کی ادا کار ہے -

انا للہ و انا الیہ راجعون

دار الحرب ——————

دار السلام میں علمائے کے خلاف دار الحرب قائم کیا گیا - مشرقی کے بیلچوں، قادیانی سیندوقوں اور

سلہ وہ دار السلام نہیں، "ادارۂ دار الاسلام" - (مودودی)

سلہ اگر جمعیت علمائے ہند کی طرف سے ایک وفد ہمارے حسابات کا معائنہ کرنے کیلیے تشریف لائے تو ہم اسکا خیر مقدم کرینگے - یہاں انکو معلوم ہو جائیگا کہ ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً اور لا تقف ما لیس لک بہ علم کی تحریم قرآن مجید میں، معاذ اللہ غلط نہیں دی گئی ہے - (مودودی

اور مسلم لیگ کی تلواروں کیساتھ مودودی صاحب کی توپ کا منہ بھی علمار حق پر کھل گیا - پنجاب میں ایک صاحب خدا کے رسول معظمؐ کے نام پر خطبہ فروشی کر کے بنیکوں میں دولت جمع کر رہے تھے یہ دوسرے صاحب اٹھے اور انھوں نے قرآن کے نام پر خطبہ فروشی شروع کردی[1] ہمارے قلم سے ایک جملہ نکلا - مودودی چالاک تاجر ہے جو خطبہ فروشی کر کے اکابر مذہب پر برس رہا ہے اس جملہ کو جسکی حیثیت صرف پاداش سنگ کی تھی - اخبار میں دیکھکر ہمارے ایک نہایت ہی قابل احترام بزرگ دریا آباد میں بیچین ہوگئے اور دوسرے بریلی میں تڑپ اٹھے[2] اب ہم سے جواب طلب کیا گیا ہے کیا کوئی مودودی خطبہ فروش ہے کیا وہ مسلم لیگ کا کارکن ہے کیا وہ اکابر مذہب پر برس رہا ہے ؟ دنیا میں بہت سے ایسے عالی دماغ لوگ موجود ہیں جو اس دماغی عصبیت کا شکار ہو جاتے ہیں جو ان کا اور ان کے فلسفی نقاد کا مشترک سرمایہ ہوتی ہے - بہرحال ہم انسان کی حیثیت سے مسئول ہیں اور مجبور ہیں کہ ان لوگوں کے سامنے جو اعتقادی سنجیدگی کے ساتھ پٹی باندھ کر ترجمان القرآن کا مطالعہ کرتے ہیں - اسکی سنجیدہ تحریروں کے کچھ نمونے پیش کریں اور فیصلہ خود عوام پر چھوڑ دیں -

سوال یہ کیا گیا ہے کہ مودودی مسلم لیگ کا ذمہ دار کارکن ہے یا نہیں ہم عرض کرینگے کہ وہ سیاست فرنگ کا ایک بہت بڑا حلیف ہے جو مسلم لیگ کے محاذ کو تقویت بہم پہنچا رہا ہے -

سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اس موقع پر جب کہ مسلم لیگ کے سرمایہ دار زعمار اور مسلمانوں کے پاس نہ کوئی پروگرام ہے اور نہ کوئی بڑا سرمایہ ہے تو دار السلام کے استعماری مقاصد کیلیے جو روپیہ

---

[1] ناظرین ترجمان القرآن میں سے اگر کسی کے ہاتھ کوئی خطبہ فروخت کیا گیا ہو تو وہ جناب صدر جمعیت علمار ہند کو اطلاع دے کر مجھے شکریہ کا موقع دیں - (مودودی)

[2] جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی اور مولانا محمد منظور صاحب نعمانی ایڈیٹر الفرقان مراد ہیں - (مودودی)

بسہولت ملا ہے وہ کہاں سے آیا[۱]۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ فلسطین کا مسئلہ جو اعتقادی حیثیت سے اسلام کے عالمگیر مسائل میں اس وقت سب سے بڑا مسئلہ ہے، ترجمان القرآن میں کیوں نظر انداز کیا گیا[۲]۔ کیا یہ اجنبی مقاصد سے کھلا ہوا ساز باز نہیں ہے کہ قرآن کے پندرہویں پارہ کی پہلی آیت کو حکمت عملی سے منسوخ کردیا جائے اور سانس تک نہ لیا جائے[۳]۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ قرآن میں یہ کونسی آیت نازل ہوئی کہ مسلم لیگ جس میں اسلامی شریعت

---

[۱] روپیہ ملنے اور بسہولت ملنے کی کوئی اطلاع ابھی تک ہمیں نہیں پہنچی۔ اگر دفتر جمعیت علماء ہند میں کوئی مصدق اطلاع اس قسم کی آئی ہو تو اس خوش خبری سے ہمیں بھی شاد کام فرمایا جائے (مودودی)

[۲] ریزولیوشن پاس کرنے اور لفظی دھمکیاں دینے کے سوا اگر کسی نے فلسطین کیلیے کچھ کیا ہو تو اس سے مطلع فرمایا جائے۔ میں نو زور کے بغیر شور مچانے کو لاحاصل سمجھتا ہوں اس لیے خاموش ہوں۔ میرے نزدیک فلسطین کے لیے اور کسی اسلامی مسئلہ کیلیے بھی ہندوستان کے مسلمان اسوقت تک کچھ نہیں کر سکتے جب تک وہ یہاں مسلمان ہونے کی حیثیت سے طاقت پیدا نہ کریں اس لیے میں تمام تر زور ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی طاقت کو مضبوط کرنے پر دیتا ہوں۔ میں نہیں سمجھا کہ یہ پندرہویں پارے کی پہلی آیت کا نسخ کیسے ہوا۔ (مودودی)

[۳] جناب نے اسی مضمون میں جن آیات پر خط نسخ پھیرا ہے انکی فہرست درج ذیل ہے۔

ویل لکل ھمن ۃ لمن ۃ - و۲جتنبو۲ قول ۲لن ور - ۲جتنبو۲ کیثر۲ من ۲لظن ۲ن بعض ۲لظن ۲ثم - ۲ن جاءکم فاسق بنبأٍ فتبینو۲ ۲ن تصیبو۲ قوماً بجھالۃ فتصبحو۲ علیٰ ما فعلتم ندٰمین - کونو۲ قو۲مین بالقسط شھد۲ءَ للّٰہ ولو علی ۲نفسکم ۲و ۲لو۲لدین و۲لاقربین -

(مودودی)

کے کھلے ہوئے باغیوں، شعائر دینی کا مزاح کرنے والوں، آزادی کے مخالفین اور فاسق وفاجر جریدہ نگاروں کی اکثریت ہے وہ ہر تنقید سے بے نیاز ہے۔ کیا یہ بات اس امر کا یقین نہیں پیدا کرتی کہ اسلام اور دارالسلام کے نام پر جو کچھ ہو رہا ہے اس کا مقصد علماء کی جماعت کے خلاف سیاسی خارجیوں کی ایک ایسی جماعت کی تشکیل ہے جو مسلم لیگ کو تقویت پہنچائے۔[۱]

دو مزید سوالات

اب دو سوال اور باقی رہ جاتے ہیں۔

(۱) مودودی اکابر مذہب پر برس رہا ہے یا نہیں؟

(۲) مودودی خطبہ فروش ہے یا نہیں؟

پہلے سوال کا جواب ہم اپنے وجدان کی بنا پر دیں گے ہم اپنے بزرگوں کے سامنے سب سے پہلے "اکابر مذہب" کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا جو کچھ بھی خیال ہو۔ ہمارے خیال میں جناح، سکندر، فضل الحق، راجہ محمود آباد، راجہ پیر پور اور ان کے سازشی ہندو رفقاء، سندر سنگھ، نلنی رنجن سرکار، سرکاوس جی، مسٹر منوہر لال اکابر مذہب نہیں ہیں۔ ہماری نظر میں مولانا حسین احمد

---

[۱] مسلم لیگ کی حمایت میں اگر کبھی کوئی لفظ میں نے لکھا ہو تو اس کا حوالہ دیا جائے۔ رہی یہ بات کہ میں اس کی مخالفت کیوں نہیں کرتا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے نزدیک اس وقت مسلمانوں کیلیے سب سے زیادہ مہلک آپکی جماعت کا رویہ ہے، اسلیے میں سب سے پہلے آپکی طرف متوجہ ہوا ہوں۔ آپ راہِ راست پر آجائیں تو انشاء اللہ دوسروں کی بھی باری آجائیگی۔ حدیث میں ہدایت کی گئی ہے کہ جب انسان دو بلاؤں میں مبتلا ہو تو چھوٹی بلا کو اختیار کرے۔ میں نے تو اس پر پورا عمل بھی نہیں کیا۔ چھوٹی بلا کو اختیار کرنے کے بجائے صرف خاموشی کے ساتھ گوارا کر رہا ہوں۔ مگر آپ علماء کے نمائندے ہو کر میرے اتنے سے عمل بالحدیث کو بھی برداشت نہیں کر سکتے؟ (مودودی)

مدنی اور مولانا کفایت اللہ صاحب اکابر مذہب ہیں اور یہ ثابت کرنا ہمارا فرض ہے کہ
مودودی ان پر برس رہا ہے[1]۔
مودودی کا ترجمان لکھتا ہے:۔
(۱) ''ان کے (مولانا حسین احمد کے) خطوط کبھی کبھی اخبارات میں شائع ہو جاتے ہیں مولانا حالات حاضرہ سے قطعاً بے خبر ہیں انھوں نے اب تک واقعات کی رفتار کو سمجھا ہی نہیں'' (کیا ان جملوں میں ایک باخبر عالم کی توہین کا کوئی پہلو نہیں؟)[2]

---

[1] ذرا سا تعبیر کا پھیر ہے۔ کسی معاملہ میں عقل و نقل سے دلیل پوچھنے کو اہل علم ''طلب حجت'' کہتے ہیں۔ اور اگر کسی کے مسلک کو غلط جان کر کوئی شخص نفس معاملہ کی حد تک اسکے خلاف دلائل پیش کرے تو معقول لوگوں کی زبان میں اسے ''اختلاف رائے'' کہا جاتا ہے۔ آپ ان دونوں چیزوں کو ''برسنے'' سے تعبیر فرماتے ہیں۔ کوئی حرج نہیں۔ الفاظ بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی۔ (مودودی)

[2] میرا اصل فقرہ یہ ہے:

''مولانا حسین احمد صاحب جنکے علم و فضل، تقویٰ و طہارت، ایثار و فدویت، اور مرکزی شخصیت کے اعتماد پر علماء کا ایک بڑا گروہ راہ راست سے ہٹ گیا ہے، معتقدین اور مقلدین کے سامنے تو بہت کچھ فرماتے ہیں مگر ناقدین کے سامنے کوئی مستند اور مفصل بیان پیش کرنے کی آج تک انہوں نے تکلیف نہ فرمائی۔ ان کے بعض مکتوبات کبھی کبھی اخبارات میں شائع ہو جاتے ہیں، مگر ان کو پڑھ کر یہ شبہ اور زیادہ قوی ہو جاتا ہے کہ مولانا حالات حاضرہ سے قطعاً بے خبر ہیں اور انہوں نے ابتک یہ سمجھا ہی نہیں کہ واقعات کی رفتار ہندوستان کو کدھر لیے جا رہی ہے، اور مسلمانان ہند کے قومی مسئلہ نے اب کیا نوعیت اختیار کر لی ہے''

(ترجمان القرآن بابت ذی الحجہ ۵۶ھ صفحہ ۲۵۹ تا ۲۶۰) بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۲۱ پر ملاحظہ ہو۔

(۲) "اب مولویوں نے بھی اشتراکیت کے سُر میں سر ملانا شروع کر دیا ہے جمعیتہ علماء کے ایک سابق نائب ناظم چشم بددور قرآن سے اشتراکیت ثابت کرتے ہیں"[۵] (یہ ایک دعویٰ ہے مگر بلا

بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۴۳ - میں اب بھی نہیں سمجھا کہ اس میں توہین کا کونسا پہلو ہے - آپ کی رائے اگر کسی شخص کے نزدیک غلط ہو تو وہ دو ہی طریقوں میں سے کوئی ایک طریقہ اختیار کریگا - اگر وہ نیک طینت ہے تو کہیگا کہ "آپ اصل معاملہ کو نہیں سمجھے - آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے - آپ نادانستہ غلطی فرما رہے ہیں" اور اگر وہ بد طینت، بازاری قسم کا آدمی ہے تو کہیگا کہ "تو بددیانتی سے ایسا کر رہا ہے، تو فلاں سے روپیہ کھا گیا ہے اور فلاں سے تو نے سازباز کر لیا ہے، اور تو آج کیا ہمیشہ سے ایسا ہی بے ایمان تھا" میں نے ان دو طریقوں میں سے پہلا طریقہ اختیار کیا اور پھر بھی مجرم ہوں - اصل یہ ہے کہ بعض لوگ اپنے اکابر کو انبیاء کے درجہ میں شمار کرتے ہیں - ان کے نزدیک ان کے اکابر کی کسی بات کو غلط کہنا اور اس پر تنقید کرنا فی نفسہ جرم ہے، خواہ یہ جرم کتنے ہی ادب کے ساتھ کیا جائے - بدقسمتی سے میں اس پوزیشن کو قبول کرنے کیلیے تیار نہیں ہوں، اسلیے میں یہ جرم کرنے سے باز نہ آؤنگا خواہ اسکے جواب میں کتنی ہی گالیاں دی جائیں -

(مودودی)

۵ اگر ارشاد ہو تو ان مولانا صاحب کا نام عرض کروں جو اشتراکیت کی تائید میں آیات قرآنی سے استدلال فرماتے ہیں؟ اور اس معتبر ذریعہ کا حوالہ بھی دیدوں جس سے ان کے اقوال مجھ تک پہنچے ہیں؟ اور یہ بھی عرض کروں کہ خود جناب مدیر الجمعیت کے اعتقادات اس بارے میں کیا ہیں؟ اور ان معتبر گواہوں کے نام بھی لکھ دوں جنہوں نے ان کے اقوال مجھ تک پہنچائے ہیں؟ ہیں تو اشارات و کنایات سے کام لے کر پردے پردے میں اصلاح کرنے کی کوشش کرتا ہوں - لیکن اگر آپ اس پردے کو اٹھوانا ہی چاہیں تو میں مجبوراً یہ بھی کرونگا -

(مودودی)

دلیل، مولانا آزاد جو جمعیتہ علماء کے صدر رہ چکے ہیں ان کے خیالات کسے معلوم نہیں۔ اخبار الجمعیتہ اشتراکی لامذہبیت کا قدیم مخالف ہے اور اس باب میں تمام علماء حق کا ایک ہی مسلک ہے مگر جھوٹ اور بہتان کیلیے کتنا مدلل اور سنجیدہ پیرایہ اختیار کیا گیا ہے جہاں اشتراکیت حقیقتاً مذہب ہے وہاں زبان اُٹھتے ہوئے پتھر ہو جاتی ہے، مسلم لیگ کے مولانا حسرت موہانی کیلیے بھی تو کوئی جملہ ارشاد ہونا چاہیئے۔ مگر مودودی سے کہیے تو کیوں کہیے۔

(۳) "جو مولوی صاحب پشاور سے مدراس تک ماس کنٹکٹ کی تبلیغ کرتے پھرتے ہیں۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے .... آپ کی ڈاڑھی یقیناً مونڈی نہیں جائے گی .... مگر رابطۂ عوام اسکی کوئی ضمانت نہیں دیتا کہ آپ کی نسل سے دوسری پشت میں کوئی اودے شنکر کوئی دیوکا رانی برآمد ...... ؟ نہ ہوگی" مدیر صدق اور مدیر فرقان کی جناب میں اس صدق مقال اور سنجیدگی پر ہمارا ہدیۂ تحسین قبول!

یہ الفاظ کس کی شان میں ہیں؟ کس کی لڑکی دیوکا رانی (ایک سینما کی ایکٹرس) بن کر برآمد ہوگی؟ کس کا لڑکا اودے شنکر ہوگا؟ وہ شخص جسکی قبائے تقویٰ کے دامن پر فرشتے نماز پڑھتے ہیں۔ وہ شخص جس نے حسین احمد کے نام سے اشراف حجاز کو مسجد نبوی میں رسول اعظم

ؐ کیا یہ بھی ضروری ہے کہ تمام اشتراکیوں کی مردم شماری کر کے ایک ایک کی نام بنام مخالفت کی جائے؟ میں مذہب اشتراکی سے جنگ کر رہا ہوں جو بالمعنی ہر اشتراکی سے جنگ ہے خواہ کوئی ہو اور کہیں ہو۔ اشخاص سے عموماً بحث کرنا میرے مسلک کے خلاف ہے۔ البتہ جب کوئی شخص مذہب کا جامہ پہن کر وہ کام کرتا ہے جو لامذہب کرتے ہیں تو مجبوراً مجھے اس کا ذکر کرنا پڑتا ہے۔

(مودودی)

کے قدموں میں بیٹھکر ۲۸ سال تک درس دیا ہے[1]۔ اس کے بعد تجاہل عارفانہ کا کمال دیکھیے کہ
کرخطاب بھی الجمعیتہ کی ہے مودودی آج بھی سنجیدہ، مصلح امت، مفکر اسلام اور امیر دار السلام

[1] سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کو سخن فہمی کا کمال کہا جائے، یا یہ سمجھا جائے کہ جمعیت علماء ہند کے دفتر میں اب تحریف الکلم عن مواضعہ کی مشق بھی شروع ہو گئی ہے۔ میں نے کراچی کے بنیادی حقوق پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ ان حقوق کی دوسری دفعہ میں باشندگان ہند کیلیے جس مذہبی آزادی کی ضمانت دی گئی ہے۔ اس کا حاصل صرف اتنا ہے کہ لوگوں کو زبردستی تبدیل مذہب پر مجبور نہ کیا جائیگا۔ رہی یہ بات کہ ایک غیر مسلم حکومت ایسی پالیسی اختیار کرے جس سے ہماری آئندہ نسلیں خود بخود دین و اخلاق سے کوری اٹھیں، تو اس پالیسی کے نفاذ اور اسکے نتائج سے یہ دفعہ ہماری حفاظت نہیں کر سکتی۔ اس سلسلہ میں میں نے لکھا تھا:

”اس آزادی کے پروانے کو لے کر جو مولوی صاحب پشاور سے مدراس تک اس کا ٹکٹ کی تبلیغ کرتے پھر رہے ہیں، انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ پروانہ آپ کو تو اتنی آزادی ضرور دیتا ہے کہ رات دن قال اللہ و قال الرسول میں مشغول رہیں۔ آپ کی ڈاڑھی یقیناً زبردستی نہیں مونڈی جائیگی۔ نہ آپ کی عبا ضبط کی جائیگی۔ نہ آپ کی تسبیح چھینی جائیگی۔ نہ آپ کی زبان درس حدیث و قرآن سے روکی جائیگی۔ مگر اس امر کی وہ کوئی ضمانت نہیں دیتا کہ آپکی نسل سے دوسری پشت میں کوئی اودے شنکر اور تیسری پشت میں کوئی دیو کا رانی برآمد نہ ہوگی۔“

بات بالکل صاف تھی۔ مطلب یہ تھا کہ ہمارے بزرگ عاجل کے بجائے آجل پر نظر کریں، اور یہ دیکھیں کہ آج جو پالیسی وہ اختیار کر رہے ہیں اسکے نتائج عام مسلمانوں کے ساتھ خود انکی اپنی آئندہ نسل پر بھی کیا مترتب ہو سکتے ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے ہیں کہ انگریزی حکومت کی تعلیمی و تمدنی پالیسی کی بدولت کیسے کیسے باخدا زاہد و عابد لوگوں کی اولاد آج بے دینی اور بداخلاقی میں مبتلا ہے۔ جن

ہے۔ خدا ہمیں اپنے بزرگوں سے بچائے۔

رہا خطبہ فروشی کا مسئلہ تو اس کیلیے یہ ضروری ہے کہ آنکھ سے ترجمان کے وہ صفحات دیکھے جائیں جہاں مودودی صاحب کے خطبوں کی تجارتی فہرست شایع ہوئی ہے اگر ہمارے بزرگ ہمارے ہی اجر و ثواب میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں تو ہم بھی اس خدمت سے انکار نہیں کرینگے۔

اگر ان تفصیلات کے بعد بھی مودودی کا دماغ صحیح ہے اور اس کے ایمان میں کوئی تعمیری نقش نظر آتا ہے اور کچھ لوگوں کا مذہب یہی ہے کہ مودودی بہر حال لایسئل عما یفعل میں داخل ہے تو ہم اپنے احباب سے عرض کرینگے لا اکراہ فی الدین مذہب میں کوئی زبردستی نہیں قد تبین الرشد من الغی راستی گمراہی کے مقابلہ میں ظاہر ہو چکی ہے لکم دینکم ولی دین تمہارا دین تمہیں مبارک اور ہمارا مذہب ہمیں مبارک، ہمیں حسین احمد پیارے تمہیں مودودی پیارا، ہمارا ناز یہ کہ ہم نصف صدی سے اسلام کی سچی تنظیم کے لوائے بلند کے نگہبان ہیں تمہارا فخر یہ کہ تم اس کی عقیدت کے اسیر ہو جو قرآن کی آیتوں کے ساتھ علماء پر گالیوں کی بارش برساتا ہے اور اودے شنکر اور دیوکا رانی کو اُمت کی ان ماؤں سے وابستہ کرتا ہے جن کی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۴۳ — بزرگوں کی نماز تہجد بھی کبھی قضا نہ ہوتی تھی، انکے بیٹے اور پوتے آج خدا اور رسول کا مذاق اڑاتے ہیں۔ جن خواتین کی دینداری کا یہ حال تھا کہ فرشتے ان کے دامن پر نماز پڑھیں انکی بیٹیاں اور پوتیاں آج پیانو کی گت پر ناچتی نظر آتی ہیں۔ اسی انجام سے میں نے ان بزرگوں کو ڈرانا چاہا تھا جو آج ایک دوسرے غیر مسلم اقتدار کی بنیادیں مضبوط کر رہے ہیں۔ یہ ایک خیر خواہ کی دردمندانہ تنبیہ تھی جسکو یہ معنی پہنائے گئے ہیں کہ یہ فلاں بزرگ کی اولاد پر حملہ ہے نعوذ باللہ من ذالک۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ہمارے اکابر علماء نے ایسے خوش فہم لوگوں کو اپنے گرد جمع کر رکھا ہے۔ (مودودی)

معصومیت پر کوئی نجیب اور شریف انسان حرف نہیں لاسکتا۔[1]

[1] اس شیریں مقالی کے بعد اگر یہ بھی ارشاد ہو جاتا کہ کانگریس کی تائید میں علمائے کرام کے پاس کونسے عقلی و نقلی دلائل ہیں، اور اگر ہمارے اُن اعتراضات کا جواب بھی کچھ عنایت ہوتا جو ہم نے دلائل و شواہد کے ساتھ پیش کیے تھے، تو واللہ کہ ہم اس سے بھی کچھ زیادہ ناز فرمائیوں کو بخوشی گوارا کر لیتے۔ لیکن افسوس کہ یہ کلام فصاحت التیام جن باتوں سے شروع ہوا تھا انہی پر ختم ہو گیا اور دلائل تک نوبت ہی نہ پہنچی۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید دلائل کے افلاس کی تلافی ان گرم گفتاریوں سے کی گئی ہے، اور ردِ اعتراضات کے جواب سے عاجز ہو کر جھنجلاہٹ اور گھبراہٹ میں اپنی پوزیشن بچانے کی یہ آخری تدبیر اختیار فرمائی گئی ہے اگر معاملہ یہی ہے تو میں عرض کروں گا کہ ایسا بودا مسلک آپ نے اختیار ہی کیوں فرمایا جس کی تائید میں معقولیت کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا؟ جب کوئی مسلک اعتراضات کے مقابلہ میں ٹھیرنے کی طاقت نہ رکھتا ہو تو مومن کا کام یہ ہے کہ اس سے رجوع کرے، نہ یہ کہ حریف کو نیچا دکھانے کیلیے پروپیگنڈا کے اُن ذلیل مغربی طریقوں پر اتر آئے جنہیں خدا اور یوم آخر کا خوف دل سے نکالے بغیر اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ طرزِ عمل تو ایک معمولی انسان کیلیے بھی شرمناک ہے، کجا کہ مسلمان اور پھر مسلمانوں میں بھی وہ جو علماء دین کی مرکزی جماعت کا نمائندہ ہو۔

(مودودی)

مقالات

اختلافی مسائل اور ان کا نقطۂ عدل

از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

(ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ)

اب ہم موجودہ مسائل مہمہ میں سے تیسرے مسئلہ پر جو قرآن و سنت کے تتبع سے متعلق ہے بحث کرنی چاہتے ہیں۔

احکام شرعیہ کی معرفت حاصل کرنے کیلئے کتاب و سنت کا جو تتبع کیا جاتا ہے اس کے مختلف مدارج ہیں سب سے اعلیٰ مرتبہ یہ ہے کہ انسان کو بالفعل احکام شرعیہ کی معرفت پر اتنا عبور ہو جائے کہ وہ مستفتیوں کے اکثر سوالوں کا جواب بآسانی دے سکے، اور انسانی زندگی میں پیش آنیوالے عام واقعات کا شرعی حل معلوم کرنے میں اسے توقف اور خاموشی سے بہت کم کام لینا پڑے ایسی مقام اجتہاد ہے۔ اس استعداد اور قابلیت کے حصول کے چند طریقے ہیں:۔

(۱) کبھی یہ استعداد احادیث میں غائر تفکر اور شاذ و غریب روایتوں کے تتبع سے حاصل ہوتی ہے، جیساکہ امام احمد بن حنبل کا خیال ہے۔ لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ اس ملکہ کے حاصل کرنے کیلئے بس یہی تفکر اور تتبع کافی ہے۔ بلکہ اس کے ساتھ ساتھ انسان کیلئے ضروری ہے کہ ایک ماہر لغت و ادب کی طرح مواقع کلام اور اسالیب بیان سے پوری واقفیت رکھتا ہو اور ایک وسیع النظر عالم کی طرح یہ بھی جانتا ہو کہ ائمۂ سلف متعارض نصوص میں جمع و تطبیق کی صورت کسطرح

پیدا کرتے تھے اور ان کے استدلال کا طریقہ کیا ہوا کرتا تھا۔

(۲) کبھی یہ قابلیت اصولِ تخریج کو پوری طرح ضبط کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ انسان کسی امام کے اصول کو سامنے رکھکر استنباط مسائل کا طریقہ جان جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ احادیث اور آثار کے ایک معتد بہ حصہ پر اس کی نظر ہو، تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ کہیں اس کا قول اجماع سے ٹکرا تو نہیں رہا ہے۔ یہ طریقہ اہلِ تخریج کا ہے۔

(۳) تیسرا راستہ جو مذکورۂ بالا دونوں راستوں کی بہ نسبت اعتدال کا راستہ کہا جاتا ہے یہ ہے کہ ایک طرف آدمی قرآن و سنت سے اتنی آگاہی رکھتا ہو کہ فقہ کے اصولی اور اجماعی مسائل اور ان کے تفصیلی دلائل کا علم اسے بآسانی حاصل ہو سکے۔ دوسری طرف بعض اجتہادی مسائل پر کامل دسترس رکھتا ہو، ان کے تمام گوشوں پر اس کی نگاہ ہو، ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دے سکتا ہو، لوگوں کے طریقہ تخریج پر نقد اور کھرے کھوٹے کی تمیز کر سکتا ہو، خواہ اس کے اندر وسعتِ نظر اور تبحر کے وہ شرائط اور لوازم نہ پائے جائیں جو ایک مجتہد مطلق کیلیے ضروری ہوا کرتے ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر اس کیلیے جائز ہے کہ مختلف رایوں کو تنقیدی نگاہ سے دیکھے، اور دو مختلف مذہبوں کے دلائل سے واقف ہو کر کچھ باتیں ایک مذہب کی اور کچھ دوسرے مذہب کی لے لے (یعنی تلفیق کرے) اور بعض ایسی تخریجات کو ترک کر دے جو اگرچہ متقدمین کے نزدیک قابلِ قبول رہی ہوں لیکن وہ اپنی تنقید اور تحقیق کی روشنی میں انھیں غلط پائے۔ اسی وجہ سے تم دیکھتے ہو کہ جن علماء کو مجتہد مطلق ہونے کا دعویٰ نہ تھا، وہ اپنی فقہی تصانیف میں خود مسائل کی تخریج کرتے ہیں اور اکابر سلف کی آراء میں موازنہ کر کے ایک رائے کو دوسری رائے پر ترجیح دیتے ہیں۔ جب اجتہاد اور تخریج دونوں قابل تجزیہ و تقسیم ہیں، اور کسی جزئی مسئلہ میں اجتہاد کرنے کیلیے آدمی کا مجتہد مطلق ہونا شرط لازم نہیں ہے تو پھر مسائل کی تحقیق میں اس طریقہ کا اختیار کرنا لوگوں کی نگاہ میں کیوں مستبعد

اور ناقابل قبول دکھائی دیتا ہے؟ تحقیق کا مقصود تو محض ظنّ غالب کے حصول تک ہے اور اسی پر تکلیف کا دار و مدار ہے۔

رہ گئے وہ لوگ جو اتنی گہری نظر نہیں رکھتے اور جنہیں اللہ نے اتنی فہم و بصیرت عطا نہیں کی ہے کہ قرآن و سنت پر غور کر کے بطور خود مسائل کی چھان بین کر سکیں، انھیں چاہیے کہ اپنی زندگی کے عام معاملات میں مذاہب مروّجہ کے اُن طریقوں اور فیصلوں کو اپنا مذہب سمجھیں جنھیں انہوں نے اپنے آباؤ اجداد کے سلسلے سے اخذ کیا ہے۔ لیکن جو واقعات معمولی نہ ہوں بلکہ اہم اور نادر الوجود ہوں ان میں اپنے کسی قریب کے مفتی کا اتباع کریں اور قضایا میں قاضی کے حکم کی تعمیل کریں۔ بس یہی ان کے لیے سب سے محفوظ راہ ہے۔

اسی خیال پر ہم نے ہر مذہب کے قدیم اور جدید علماء محققین کو پایا ہے اور تمام ائمۂ مذاہب نے اپنے پیروؤں کو اسی کی وصیت بھی کی ہے۔ الیواقیت والجواہر میں ہے:

"ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ جو شخص میری دلیل سے واقف نہ ہو اسے میرے قول پر فتویٰ دینے کا کوئی حق نہیں۔ خود امام موصوف جب کوئی فتویٰ دیا کرتے تو کہتے یہ نعمان ابن ثابت کی (یعنی میری) رائے ہے جسے ہم نے اپنے علم و فہم میں بہتر سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اگر کوئی اس سے بہتر اور احسن رائے پیش کرے تو پھر ہماری رائے کے مقابلہ میں اسکی رائے صائب اور حق سے زیادہ قریب ہو گی۔"

"امام مالک رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ ہر شخص کے اقوال دو قسم کے ہوتے ہیں کچھ لے لینے کے قابل اور کچھ رد کر دینے کے قابل۔ صرف ایک ذات اس کلیہ سے مستثنیٰ ہے اور وہ رسول اللہ کی ذاتِ معصوم ہے۔"

"حاکم اور بیہقی نے امام شافعی سے روایت کی ہے کہ وہ فرمایا کرتے تھے جب کوئی حدیث پایۂ صحت کو پہنچ جائے تو اسی کو میرا مذہب سمجھو۔ ایک دوسری روایت میں امام صاحبؒ کا یہ قول منقول ہے کہ جب تم یہ دیکھو کہ میرا قول حدیث نبوی کی مخالفت کر رہا ہے تو حدیث پر عمل کرو اور میرا قول دیوار پر دے مارو۔ ایک روز امام مزنیؒ سے آپ نے فرمایا کہ ابراہیم میری ہر بات کی کورانہ تقلید نہ کرو بلکہ بذاتِ خود اس میں غور کر لیا کرو کیونکہ یہ دین کا معاملہ ہے۔"

"امام احمد بن حنبل کا قول ہے کہ اللہ اور رسول کے مقابلہ میں کسی کی رائے کو کوئی وقعت حاصل نہیں۔ تم نہ میری تقلید کرو اور نہ کسی اور امام کی۔ جس طرح انہوں نے کتاب وسنت سے احکام دین کی معرفت حاصل کی تم بھی حاصل کرو۔ کسی شخص کو فتویٰ دینے کا استحقاق نہیں تاوقتیکہ وہ تمام ائمہ کے مذاہب اور اقوال سے پوری طرح واقف نہ ہو۔ اگر اس سے کوئی ایسا مسئلہ پوچھا گیا جسکے متعلق اسے معلوم ہے کہ اس میں وہ تمام ائمہ جنکی عموماً پیروی کی جاتی ہے، متفق ہیں تو وہ یوں کہہ سکتا ہے کہ یہ جائز ہے اور وہ ناجائز ہے، کیونکہ ایسی صورت میں اس کا اپنا قول اور فتویٰ نہ ہوگا بلکہ ائمۂ مجتہدین کے قول کی ترجمانی ہوگی۔ لیکن اگر مسئلہ ایسا ہے جس میں علماء کی رائیں مختلف ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ تو کہہ سکتا ہے کہ فلاں امام کے نزدیک یہ جائز ہے اور فلاں کے نزدیک ناجائز، مگر اسے یہ حق نہیں ہے کہ بقیہ اقوال کو چھوڑ کر کسی ایک رائے کو اختیار کر کے فتویٰ دیدے، الا آنکہ اس رائے اور مذہب کے دلائل سے بخوبی باخبر ہو۔"

"امام ابو یوسفؒ اور زفرؒ وغیرہ علماء سے منقول ہے کہ جب تک کوئی شخص یہ

نہ معلوم کرے کہ ہم نے یہ رائے کہاں سے اخذ کی ہے اس وقت تک وہ ہمارے اقوال پر فتویٰ دینے کا مجاز نہیں۔"

"عصام ابن یوسفؒ سے جب کہا گیا کہ آپ امام ابو حنیفہؒ کی رایوں سے اکثر اختلاف کرتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ اسکی وجہ کھلی ہوئی ہے۔ انہیں جو فہم اور دقتِ نظر حاصل تھی ہمیں حاصل نہیں، وہ ڈوب کر جن گہرائیوں سے حقائق نکال لاتے ہیں وہاں تک ہماری کمزور نگاہوں کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ اور ہمارے لیے جائز نہیں کہ بغیر سمجھے بوجھے ان کے اقوال پر فتویٰ دیں۔"

"ابوبکر الاسکاف البلخی سے پوچھا گیا "کیا ایسے شخص کیلیے جو اپنے شہر کا سب سے بڑا عالم ہو، جائز ہے کہ فتویٰ دینے سے رکا رہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ اگر وہ عالم درجۂ اجتہاد رکھتا ہو تو جائز نہیں۔ لوگوں نے کہا کہ درجۂ اجتہاد کب حاصل ہوتا ہے؟ جواب دیا کہ جب ایک شخص مسائل کے تمام پہلوؤں پر نگاہ رکھتا ہو اور معترضین کو معقول اور تسلی بخش دلیلوں سے خاموش کرسکے تو وہ مجتہد ہے۔"

ابن الصلاح کا قول ہے کہ "اگر کوئی شافعی ایسی حدیث پائے جو اس کے مذہب کے خلاف ہو تو اسے اپنے علم اور تفقہ کا جائزہ لینا چاہیے۔ اگر وہ اپنے اندر اجتہاد مطلق کی یا خاص اسی ایک مسئلہ میں اجتہاد کرنے کی پوری استعداد پائے تو اس کیلیے ضروری ہے کہ غور کرنے کے بعد اس حدیث پر عمل کرے اور تقلید کا خیال ترک کردے۔ لیکن اگر وہ اپنے کو اس مقام سے فروتر محسوس کر رہا ہے اور اجتہاد کی طاقت سے بے بہرہ ہے مگر غور و فکر کرنے کے بعد کوئی معقول دلیل نہ پانے کی وجہ سے حدیث کی مخالفت بھی اس پر شاق گذر رہی ہے تو بھی حدیث

ہی کا اتباع کرنا چاہیے بشرطیکہ امام شافعی کے بجائے کسی اور امام نے اس پر عمل کیا ہو کیونکہ اس صورت میں اس دوسرے امام کا اتباع امام شافعی کے اتباع کا قائم مقام ہو جائیگا۔ یہ ابن الصلاح کی رائے ہے اور امام نوَوِی نے بھی اسی کو مستحسن اور مختار قرار دیا ہے۔

چوتھا مسئلہ جسے ہماری جاہلانہ اور متعصبانہ ذہنیتوں نے اختلاف اور شقاق کی رزمگاہ بنا لیا ہے وہ فقہاء کا باہمی اختلاف ہے۔ حالانکہ ان اختلافات میں سے اکثر، (خصوصاً جن میں صحابہؓ بھی مختلف تھے اور دونوں طرح کی رائیں ان سے منقول ہیں، مثلاً تشریق اور عیدین کی تکبیروں کا اختلاف، نکاح مُحرِم (حج کیلیے احرام باندھنے والے) کے جواز کا اختلاف، ابن عباسؓ کے تشہد اور ابن مسعودؓ کے تشہد کا اختلاف، بسم اللہ اور آمین کو آہستہ یا بلند آواز سے کہنے کا اختلاف وغیرہ) فی نفسہٖ آپس میں نہ کوئی اساسی تباین رکھتے ہیں اور نہ انکی اصل مشروعیت میں ائمۂ سلف کا کوئی اختلاف ہے۔ بلکہ اختلاف جو کچھ ہے وہ محض ایک .... کو دوسرے پر ترجیح دینے میں ہے۔ یہ سبھی مانتے ہیں کہ یہ تمام مذاہب کتاب و سنت سے مستنبط ہیں۔ لیکن چونکہ ہر شخص کی نظرِ تحقیق اور قوتِ اجتہاد جداگانہ ہوا کرتی ہے، اس وجہ سے جو مذہب دوسرے کے نزدیک مرجوح تھا اس کے نزدیک راجح اور اولیٰ ثابت ہوا اور اس نے اسے اختیار کر لیا۔ مثال کے طور پر قرأت کو لو اور دیکھو کہ قرّاء ایک ہی لفظ اور آیت کی قرأت میں کسقدر مختلف ہیں۔ یہی حال علمائے فقہ کے اختلاف کا ہے۔ چنانچہ وہ اکثر اپنے اختلاف کی تعلیل بھی یہی کرتے ہیں کہ صحابۂ کرام کی یہ رائے بھی تھی اور وہ بھی، یعنی وہ بھی آپس میں اختلاف رائے رکھتے تھے۔ حالانکہ وہ سب کے سب ہدایت کی روشن شاہراہ پر تھے۔ کون ہے جو ان کے کسی فرد پر گمرہی اور سنت نبوی کی مخالفت کا الزام عائد کر سکتا ہے؟ یہی وجہ ہے کہ علمائے حق مسائل اجتہادیہ میں تمام ارباب افتار کے

فتووں کو جائز سمجھتے اور قضاۃ کے فیصلوں کو تسلیم کرتے آئے ہیں اور بسا اوقات اپنے مذہب کے خلاف بھی عمل کرتے رہے ہیں۔ چنانچہ تم اس قسم کے اختلافی مسائل کے بارہ میں تمام ائمۂ مذاہب کو دیکھو گے کہ وہ مسئلہ کو پھیلا کر بیان کرنے اور تمام اختلافی پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کے بعد یہ بھی فرما دیتے ہیں کہ "یہ میرے خیال میں احوط طریقہ ہے"، "یہ رائے مختار ہے"، "یہ میرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے" اور کبھی یوں کہتے ہیں کہ "ہم تک صرف یہی حکم پہنچا ہے"۔ اسکے شواہد المبسوط، آثار محمدؒ اور اقوال شافعیؒ میں بے شمار موجود ہیں۔ یہ وہ مبارک دور تھا جب دین کا چشمۂ صافی شقاق و نزاع کے مہلک جراثیم سے قریب قریب پاک تھا اور اجتہادی اختلافات جامۂ ملت کیلیے مقراض کا کام نہیں دے رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد تعصب کا طوفانی سیلاب آیا۔ نگاہوں کی وسعت کم ہونے لگی۔ لوگوں نے بقیہ اختلافی پہلوؤں سے صرف نظر کر کے صرف ایک پہلو کو لے لیا۔ اب اختلافات کی نوعیت پہلی سی نہ رہی۔ انھیں بے حد اہمیت دے دی گئی۔ ان کی آڑ میں فرقہ پرستی وجود میں آگئی۔ لوگوں کا ذوقِ تحقیق، جمود سے بدل گیا اور وہ اپنے ائمہ کے اختیار کردہ مسلک پر سختی سے جم گئے۔

اور یہ جو بعض علمائے سلف سے اپنے ائمہ کے مذاہب پر ہمیشہ قائم رہنے کی تاکید منقول ہے، سو یہ یا تو ایک رجحان فطری کی بنا پر ہے کیونکہ ہر انسان اپنے پیشواؤں اور بزرگوں کی مختار اور پسندیدہ چیزوں کو بڑی قدر اور محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے یہانتک کہ ہم عام رسوم و رواج کے اندر بھی اس رجحان فطری کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ یا پھر اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے مذہب کے دلائل کی عظمت اور قوت سے مرعوب تھے اور ان کے خیال میں یہ دلائل بہت ہی مضبوط اور ناقابل تردید تھے۔ یہ اور اسی قسم کی اور وجہیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن بعض لوگوں کا یہ خیال کہ تعصب کی سرشاری میں انہوں نے یہ کلمات کہے، محض وہم بلکہ سراسر بہتان ہے۔

اب ذرا ان اختلافات کی اصلیت پر غور کرو جن پر فرقہ بندیوں کا محاذِ جنگ قائم ہو رہا ہے، اور دیکھو کہ صحابہ، تابعین اور ان کے بعد کے ائمہ سلف نے ہمارے لیے کونسا اسوہ چھوڑا ہے؟ ان تمام کا حال یہ تھا کہ ان میں سے بعض لوگ بسم اللہ پڑھتے تھے۔ بعض لوگ نہیں پڑھتے تھے۔ کچھ لوگ نماز فجر میں دعائے قنوت پڑھتے تھے، کچھ لوگ نہیں پڑھتے تھے۔ اگر ان میں ایک جماعت ایسی تھی جو قے کرنے اور پچھنے لگوانے کے بعد تجدید وضو کو ضروری خیال کرتی تھی تو ایک جماعت ایسی بھی تھی جو اسکی مطلقاً ضرورت نہ سمجھتی تھی۔ یہ اور اسی قسم کے بیسیوں اختلاف موجود تھے لیکن اسکے باوجود وہ سب ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔ کسی نے کسی کی اقتدار سے کبھی انکار نہیں کیا۔ امام ابو حنیفہ اور اسکے تلامذہ اور امام شافعیؒ وغیرہ مدینہ والوں کے پیچھے نمازیں پڑھا کرتے تھے حالانکہ اہلِ مدینہ سرے سے بسم اللہ پڑھتے ہی نہ تھے۔ نہ آہستہ اور نہ زور سے۔ امام ابو یوسف نے ہارون الرشید کے پیچھے نماز پڑھی، حالانکہ اس نے حجامت (پچھنے لگوانے) کے بعد وضو کی تجدید نہیں کی تھی۔ امام ابو یوسف کے مذہب میں پچھنوں کے بعد تجدید وضو لازم ہے مگر امام مالک کے مذہب میں لازم نہیں ہے۔ اسی طرح امام احمد بن حنبل حجامت اور نکسیر کو ناقض وضو مانتے ہیں، لیکن جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ ایسے امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے جس نے بدن سے خون نکلنے کے بعد وضو نہ کیا ہو تو آپ نے جواب دیا یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ امام مالکؒ اور سعیدؒ بن المسیب کے پیچھے میں نماز نہ پڑھوں ؟ (جن کے نزدیک یہ چیزیں نواقض وضو میں سے نہیں ہیں)

روایت ہے کہ امام ابو یوسف اور امام محمدؒ عیدین میں خلیفہ ہارون کی رعایت سے حضرت ابن عباس کے مذہب کے مطابق تکبیریں کہا کرتے تھے، حالانکہ ان دونوں اماموں کا مذہب اس کے خلاف تھا۔

امام شافعیؒ نے مقبرۂ امام ابوحنیفہ کے قریب فجر کی نماز پڑھی تو محض ان کے لحاظ اور ادب سے دعائے قنوت کو ترک کر دیا۔ اور فرمایا کہ بسا اوقات ہم اہل عراق کے مسلک پر بھی عمل کر لیتے ہیں۔

امام ثانیؒ (امام ابو یوسفؒ) کے متعلق البزازیہ میں ہے کہ آپ نے جمعہ کے روز حمام میں غسل کیا اور لوگوں کو نماز پڑھائی۔ نماز پڑھکر جب لوگ ادھر ادھر منتشر ہو گئے تو آپ کو اطلاع دی گئی کہ حمام کے کوئیں میں ایک مرا ہوا چوہا موجود ہے۔ امام موصوف نے یہ سن کر فرمایا کہ "تو پھر اس وقت ہم اپنے مدنی بھائیوں کے مسلک پر عمل کرتے ہیں کہ جب پانی دو قلّہ کی مقدار میں ہو تو وہ نجس نہیں ہوتا اس کا حکم ماء کثیر کا ہو جاتا ہے۔"

امام خجندیؒ سے پوچھا گیا کہ اگر ایک شافعی المذہب آدمی نے دو ایک برس کی نماز چھوڑ دی ہو اور اس کے بعد وہ حنفی مذہب اختیار کر لے تو پھر وہ کسطرح نماز کی قضا کرے؟ آیا امام شافعی کے مذہب کے مطابق یا حنفی مذہب کے مطابق؟ جواب دیا کہ جس مذہب کے مطابق اس نے قضا کر لیا جائز ہے، بشرطیکہ اس کے جواز کا اعتقاد رکھتا ہو۔

جامع الفتاویٰ میں ہے کہ اگر کسی حنفی نے یہ کہا کہ "اگر میں فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس پر طلاق، اس پر طلاق، اس پر طلاق (یعنی تین طلاقیں دیں)" پھر اس نے کسی شافعی المذہب فقیہ سے فتویٰ پوچھا اور اس نے جواب دیا کہ "اس پر طلاق نہ پڑے گی اور تمہاری یہ قسم لغو مانی جائے گی"، تو اس مسئلہ میں امام شافعی کی اقتداء کرنے میں اس کیلیے کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اکثر صحابۂ کرام کی تائید اسی مسلک کو حاصل ہے۔

امام محمدؒ نے اپنی امالی میں فرمایا ہے کہ "اگر کوئی فقیہ اپنی بیوی کو ان لفظوں میں طلاق دے کہ "انتِ طالقٌ البتۃ" اور وہ اپنے مذہب کے مطابق ایسے طلاق کو تین طلاق یعنی طلاقِ

بائن سمجھتا ہو، لیکن قاضی وقت فیصلہ کردے کہ یہ طلاق رجعی ہے، تو اُس کے لیے رجعت کرنے کی گنجائش ہے"

اسی طرح تحریم وتحلیل اور معاشرۃ اور لین دین کے اُن تمام معاملات میں جنکے اندر فقہاء اور ائمہ کی رائیں مختلف ہیں، ہر فقیہ پر لازم ہے کہ اگر دار القضاء سے اسکے مذہب فقہی کے خلاف فیصلہ ہو تو وہ اپنی رائے اور اپنے مسلک کو چھوڑ کر قاضی کے فیصلہ پر عمل کرے۔

(باقی)

اشاعت خاص ترجمان القرآن

رجب ۵۷ھ کی اشاعت، ترجمان القرآن کی اشاعت خاص ہوگی جس میں شعبان ۵۶ھ سے اب تک کے تمام "اشارات" یکجا شائع کیے جائینگے۔ ان مضامین کو از سر نو مرتب کیا گیا ہے، اور بہت سے اہم مباحث کا اضافہ کردیا گیا ہے۔ ضمیمہ کے طور پر جناب ساربان کا مضمون "متاع کارواں" بھی اسکے ساتھ ہوگا۔

پچھلے مضامین کا مجموعہ جو "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے نام سے شائع ہوا تھا، آٹھ ہزار کی تعداد میں طبع کیا گیا تھا اور قریب قریب سب نکل گیا۔ اس مقبولیت کو دیکھ کر یہ دوسرا مجموعہ سات ہزار کی تعداد میں طبع کیا جارہا ہے۔ ضخامت تقریباً ۱۶۰ صفحہ ہوگی قیمت فی نسخہ ۵/۔ ایکروپیہ میں ۴ نسخے۔ ۲۰ روپے میں سو نسخے علاوہ محصولڈاک

جو حضرات اسکی اشاعت میں حصہ لینا چاہتے ہوں وہ مہتمم شعبۂ اشاعت دار الاسلام کے پاس فرمائش بھیجیں۔

معرکۂ اسلام و جاہلیت

بدء الاسلام غریبا وسیعود غریبا

از جناب مولوی صدر الدین صاحب اصلاحی

(۴)

تیئیس سالہ عہد رسالت کی مسلسل جد و جہد کے بعد جاہلیت سرنگوں ہوگئی۔ میدان فکر و عمل کے ایک ایک گوشہ سے اس کے قدم اکھڑ گئے۔ روح انسانی آزاد اور نفس حیوانی مغلوب و مقہور ہو کر رہ گیا۔ جو کبھی جاہلیت کے سپاہی تھے وہ پرچم اسلامی کے نیچے آ کھڑے ہوئے اور انہوں نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے آہنی قلعوں کو زیر و زبر کر کے رکھ دیا۔ یہ اسلام یا عقل و فطرت کی اس کامل فیروزمندی اور عظیم الشان کامیابی کا وقت تھا جسکی مثال آپ تاریخ انسانی کے کسی صفحہ پر نہیں پا سکتے اور کون کہہ سکتا ہے کہ مستقبل آپکی اس آرزو کو پورا کرنے میں کامیاب ہوگا۔

دراصل پیغمبر آخر الزماں کی بعثت کا مقصد وحید بھی صرف یہی تھا کہ انسانی فطرت کو جاہلیت کی چیرہ دستیوں سے آزاد کرا دیں اور باطل کی کسیہ کاریوں نے حقانیت کا جو نظر فریب نقاب اوڑھ رکھا ہے اسے ہٹا کر سچائی کا حقیقی جمال نگاہوں کو دکھا دیں۔ اسی بنا پر قرآن حکیم کو "تذکرہ" کہا گیا ہے کہ یہ غفلت و خود فراموشی کی مدہوشیوں سے بیدار کر کے انسان کو اس کے بھولے ہوئے فرائض یاد دلاتا ہے، "کتاب مبین و نور مبین" کہا گیا ہے کہ یہ جہل کی تاریکیوں میں گم ہو جانے والے آثار ہدایت کو ظاہر کرتا ہے۔ "فرقان" کہا گیا ہے کہ یہ حق و باطل

کی سرحدوں کو الگ کرتا ہے۔ لیکن جیسا کہ آپ کو پچھلی تفصیلات سے معلوم ہو چکا ہے، قرآن یہ سب کچھ ہونے کے باوجود ابتداءً انسان کے لیے ایک انوکھی اور نا قابلِ فہم و قبول چیز تھا جسکی وجہ انسان کی محض ارادی شرارت ہی نہ تھی، بلکہ بڑی حد تک اسکی بے چارگی بھی تھی۔ اُس کی بدبختی میں اُس کے فساد مذاق سے بڑھکر ماحول کی زبردست قوت، عادی، رسوم و افکار کی دماغوں پر مسلسل حکمرانی، جاہلیت کی ظاہری سربلندی اور اسلام کی مظلومی کا دخل تھا۔ اسی بنا پر قرآن اور صاحب قرآن نے عقل و فطرت کی صیقل گری میں پیہم ۲۳ سال گذار دیئے، اور افہام و تفہیم کیلیے جو طریقہ بھی مؤثر ہو سکتا تھا اختیار کیا۔ آخر میں اس نے کہہ دیا کہ اب تمہارے بے عذر کا کوئی موقع باقی نہیں رہتا۔ اللہ کی حجت پوری ہو چکی، حق پوری طرح واضح ہو چکا، اب صرف تمہاری استعداد فطرت پر سارا معاملہ چھوڑ دیا جاتا ہے:

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ — دین کے معاملہ میں کوئی زبردستی نہیں، ہدایت، ضلالت سے متمیز ہو چکی۔

یعنی اسلامی تعلیمات سے مانوس ہونے میں جتنے موانع تھے، سب کی حقیقت کھول دی گئی ہے اور انوار حق پر جاہلیت و رسم پرستی کے جتنے سیاہ بادل چھا گئے تھے وہ اب چھٹ چکے ہیں۔ حسن فطرت نکھر کر مشہود ہو چکا ہے۔ جس کا جی چاہے اس کے حلقہ کی اسیری قبول کرے، جس کا جی چاہے انکار کر دے۔ ردّ و قبول کا انحصار ذوق نظر پر ہے، جبر و اکراہ پر نہیں۔ قرآن کی مخاطب عقل ہے، جسم نہیں۔ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا اور وادی شک و اضطراب میں بھٹکنے والی عقلوں کے سامنے جنھیں جاہلیت کی پھیلی ہوئی تاریکیوں میں سرگشتگی و حیرانی کے سوا کچھ نظر نہ آتا تھا، "رشد" کی نورانی تصویر پیش کر دی۔ جن دلوں میں قبول حق کی صلاحیت موجود ہو گی وہ ان بھولی ہوئی باتوں کو اپنی متاع گم گشتہ سمجھ کر لے لیں گے، اور جو اپنی صلاحیتوں

کو فنا کر چکے ہیں، جنکی طبیعتوں پر زنگ چڑھ چکا ہے، جو رسم کے بندے اور محسوسات کے غلام ہو چکے ہیں، ضد و شقاق جن کا شیوہ اور آبار پرستی و جہل پرستی جن کا ایمان ہو چکا ہے جو انسانیت کے جوہر امتیاز سے محروم ہو کر مبل ھم اضل کی لعنتوں میں محصور ہو چکے ہیں، ان کے لیے بھی "غی" وضلالت کی شاہراہ ممیز کر کے دکھادی گئی ہے، وہ اگر اس پر چلنا چاہیں تو خوشی سے چل سکتے ہیں، لیکن ہیں دونوں راہیں الگ الگ، اشتباہ اور التباس کے سارے پردے اٹھا کر قرآن نے دونوں کے درمیان ایک واضح خط امتیاز کھینچ دیا ہے۔ لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ۔

قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ، دراصل اعلان تھا مقصد رسالت کی تکمیل کا۔ رسول اللہ صلعم کا کام صرف اتنا ہی تھا کہ جاہلیت کی اس عالمگیر گرفت سے حساس اور مستعد دلوں کو آزاد کر کے ان میں اسلام کی روشنی بھر دیں، اور آہستہ آہستہ جاہلیت کے سارے اثرات مٹا کر اسلام کا بلند و برتر نظام زندگی اور اسکا خالص عقلی تصور حیات ان کے دل و دماغ پر نقش کر دیں تاکہ وہ جو کچھ دیکھیں اسلام کی نگاہ سے، جو کچھ سوچیں اسلام کے دماغ سے، جو کچھ کریں اسلام کے ہاتھ سے، وہ اسلام کے سرفروش علمبردار ہوں، حقیقی معنوں میں خلیفۃ اللہ فی الارض ہوں، اپنی فکری و عملی قوتوں سے جہالت زدہ ذہنیتوں کا نقشہ الٹ کر رکھ دیں، اور رفتار زمانہ کا رخ پھیر کر اس کی زمام نفس کے ہاتھوں سے لیکر عقل و انسانیت کے ہاتھوں میں دے دیں۔ جب یہ کام ۲۳ سال کی ان تھک کوششوں کے بعد سرانجام پا گیا تو اللہ رب العزت کا پیام آیا:

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ	جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے، اور
وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي	تو دیکھے کہ لوگ اللہ کے دین میں گروہ در

دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّکَ گروہ داخل ہو رہے ہیں تو اپنے پروردگار وَاسْتَغْفِرْہُ اِنَّہٗ کَانَ تَوَّابًا۔ (سورۂ نصر) کی حمد کے ساتھ اسکی پاکی بیان کر، اور اس سے مغفرت طلب کر، بیشک وہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا ہے۔

گویا رسول اللہ صلعم کی دنیوی زندگی کا اختتام اسی لمحہ کا منتظر تھا اور جب وہ وقت آگیا کہ نصرت الٰہی نے جاہلیت کے سارے قلعے منہدم کر کے اسلام کی شوکت کو بلند اور اس کی صداقت کو بے حجاب کر دیا اور نتیجہ کے طور پر اسکی بلند تعلیمات سے بدکنے والے انسان دوڑ دوڑ کر اس سے ہم آغوش ہونے لگے تو اب ہادیؑ کی ضرورت نہ رہی اور اشارۂ غیبی بلاوا لیکر حاضر ہوگیا۔

اس کے بعد وہ جماعت، جو درسگاہ نبوت میں تربیت پاکر اسلامی نظریات کے سانچے میں ڈھل چکی ہے، نظام اسلامی کو قائم کر کے آگے بڑھتی ہے۔ اُس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار ہے۔ اقامتہ عدل اور اعلائے کلمتہ اللہ کا مقدس جذبہ اُس کی رہنمائی کرتا ہے۔ اور وہ روم وایران کی طاغوتی ملوکیتوں کو زیروزبر کر کے محض اپنا سیاسی اقتدار جمانے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ ساتھ ہی ساتھ ان جاہلی نظریات اور افکار کو بھی الٹتی جاتی ہے جن کے زیر سایہ عالم انسانی کا پورا نظام تہ و بالا ہو رہا تھا۔ اس نے جسقدر زمین کی منفعتوں اور تاج وتخت کی عزتوں کو فتح کیا اس سے بہت زیادہ انسانی افکار وعواطف اور عام نظریات وتصورات پر اپنی عالمگیر حکمرانی قائم کی۔ مسلمانوں کی تلوار ابھی قسطنطنیہ ہی میں سرگرم پیکار تھی لیکن قرآن کی شعاعیں فاتحانہ وسط یورپ تک پہنچ چکی تھیں۔ فاتح مجاہدین نے جو کہ خود قرآنی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، جن جن قوموں کو فتح کیا انھیں بھی اسی رنگ میں رنگ لیا۔ اُن کے سواد اعظم کو قرآنی نظریات وافکار میں جذب کر لیا اور اپنی علمی وعملی قوتوں کے ذریعہ ان کی ذہنیتوں میں ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ وہ خود اسلامی فکر اور قرآنی تہذیب کی علمبردار بن

گئیں۔ ان میں سے جو فطرتاً حق پرست اور راست کیش تھے انہوں نے اس پورے نظام ہی کو قبول کر لیا اور جنکی عقل اور فطرت حمیت جاہلیت کی بندشوں میں سخت جکڑی ہوئی تھی، اگرچہ وہ اپنی زبان کو تو لا الٰہ الا اللہ کہنے سے بچا لیگئے لیکن اسلامی فکر و نظر کا اثر قبول کرنے سے وہ بھی اپنے دماغوں کو نہ روک سکے، کیونکہ یہ ان کے بس میں نہ تھا۔ اسلام کا سیلاب اپنی مادی اور روحانی دونوں قوتوں سے نہایت ہی بے پناہی کے ساتھ آگے بڑھ رہا تھا، اور ہر اس.... فکر و عمل کیلیے جسکی بنیاد نفسانیت اور جہالت پر رکھی گئی تھی، اس کی رو میں ٹھیرنا بالکل ناممکن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چینی، ہندی، فارسی، اسپینی، رومی، مصری، افریقی، غرض جو تہذیب بھی اس سے ٹکرائی چور چور ہو گئی۔

اُس وقت مسلمانوں پر اسلامی نظریات چھائے ہوئے تھے، قرآن ان کی فکری و عملی قوتوں پر پورے طور پر حکمران تھا، جہاد اور اجتہاد کی روح ان کی رگوں میں برقی لہر کی طرح دوڑ رہی تھی، وہ محض فاتح اقوام نہ تھے بلکہ فاتح اذہان و قلوب بھی تھے، علم و فن کے پیشوا بھی تھے، صرف تلوار کے دھنی نہ تھے بلکہ قلم کے امام بھی تھے۔ قرآن سے روشنی لے کر انھوں نے علم و عمل کے گوشوں کو منور کیا، تحقیق و اکتشاف کی راہ کھولی، اور اپنی مجتہدانہ قوتِ فکر سے دنیا کی امامت کا منصب حاصل کر لیا۔ اس وقت علم تھا تو ان کا، تمدن تھا تو اُن کا، تہذیب و سیاست تھی تو ان کی۔ اُنہی کی تحقیق، تحقیق سمجھی جاتی تھی، اور جس چیز کو وہ غلط ٹھیراتے تھے وہی غلط تسلیم کر لی جاتی تھی۔ ان کے علوم کے دھارے ایشیا سے گذر کر قسطنطنیہ اور اسپین کے راستوں سے یورپ کے خشک دماغی صحراؤں میں پہنچے اور صدیوں تک آبحیات کی طرح اس مردہ زمین کو سینچتے رہے یہاں تک کہ اس میں وہ نئی زندگی پیدا ہوئی جسے یورپ کی نشأۃ ثانیہ (Renaissance.) کہا جاتا ہے۔ یہ زندگی اور روح اسی فکر اسلامی کی بخشی ہوئی تھی اور آج کوئی متعصب سے متعصب یوروپین بھی اس حقیقت

کا انکار نہیں کرسکتا۔

فکری انقلاب کی یہ ایک لمبی داستان ہے جسکی تفصیل وقت کے ساتھ ایک مستقل تصنیف چاہتی ہے۔ یہاں ان اجمالی اشارات کو پیش کرنے کا مقصود صرف یہ ہے کہ اسلام کی اُس حالت کا اندازہ لگایا جاسکے جو "بدءَ غریباً" اور "سیعود غریباً" کے درمیان تھی، یعنی اس حالت کا جب کہ اسلام تقریباً پوری طرح غالب اور سربلند تھا اور اس کا نظامِ عملی دنیا میں ظاہر ہوکر جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا کی عملی تفسیر بن چکا تھا۔ یہ نظام وہی اسلام کا "غریب" نظام اور یہ تعلیم اسلام کی وہی انوکھی تعلیم تھی جس پر کل تک سفاہت اور بے عقلی کے فتوے لگائے جاتے تھے، جیسے روم و ایران کی "مہذب اقوام" نے وحشت کی سند عطا کی تھی، جس کو سن کر حیرت و استعجاب کے قہقہے بلند کئے جاتے تھے۔ لیکن اسے وقت کا کرشمہ کہو یا صداقت کی قوتِ تسخیر کہ دیکھتے دیکھتے عقل و سفاہت اور وحشت و تہذیب کا معیار بدل گیا۔ اب دنیا کو حیرت تھی تو یہ کہ ایسی "معروف تعلیم" پر کوئی حیرت کا اظہار کیسے کرسکتا ہے؟ اب معمورۂ ارضی کا ہر گوشہ اس "مانوس و مقبول" تصورِ حیات میں جذب ہونے کیلیے بے قرار تھا اور جو بات کل تک ضمیر کی توہین اور عقل کی موت خیال کی جاتی تھی وہی اب اسکی عظمت اور زندگی سمجھی جانے لگی۔ گویا سارے جہان کا زمین و آسمان ہی بدل گیا۔

یہ تو تھا اُس غریب تعلیم کا حال۔ اور ان "غرباء" کا کیا حال ہوا جو کبھی وحشی، مجنون، سودائی، فریب خوردہ، احمق اور سفیہ کہے جاتے تھے؟ وہی حقارت کی نگاہوں سے دیکھنے والی دنیا اب ان کے قدموں میں پڑی ہے، فراعنۂ وقت جھک جھک کر ان کی اطاعت کرنے میں عزت محسوس کرتے ہیں، تاج و تخت ان کے لیے خالی ہو رہے ہیں، ان کی فاتحانہ عزیمت کے سامنے زمین کی پہنائی سمٹی جاتی ہے اور ان کو جگہ دینے کیلیے قوموں کے دل و دیدہ بچھے جاتے ہیں۔

شام کے عیسائیوں کا حال آپ نے پڑھا ہوگا۔ ابھی انہیں مسلمانوں کی حکومت میں آئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے، اور ابھی اسلامی فوجیں اس نواح سے سرکی ہی تھیں کہ انھیں رومیوں کی جنگی تیاریوں کی خبر ملی۔ اگرچہ رومی حملہ آور ان کے اپنے ہم قوم اور ہم مذہب تھے، لیکن انھوں نے خود ان کے ارادوں کی اطلاع مسلمانوں کو دیدی۔ پھر جب مسلمانوں نے اس حملہ کی فوری مدافعت سے اپنے کو قاصر محسوس کیا اور جزیہ کی رقم انھیں واپس کرتے ہوئے کہا کہ ہم نے یہ رقم محض تمہاری حفاظت کیلیے لی تھی، اسوقت ہم اس فرض کو پورا کرنے سے معذور ہیں، اس لیے اس کا لینا بھی اسلام کی رو سے جائز نہیں، تو اہلِ شام کی آنکھیں اشک ریز ہو گئیں اور بے اختیار بول اٹھے کہ خدا تمہیں جلد واپس لائے۔

حق کی گیرائی اور عدل کی جاذبیت کا یہ کمال دیکھو کہ جو دنیا قومیت کی پجاری اور وطنیت پر مرِ مٹنے والی تھی اور اسلامی تعلیمات کو عقل و خرد سے نہایت فروتر سمجھتی تھی، وہی جب خلافت الٰہی کی نعمتوں کی لذت شناس ہو جاتی ہے اور اسلامی نظام کو قریب سے اسکی اصلی شکل میں دیکھتی ہے تو خود بخود اس کی غلامی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیتی ہے۔

یہ تفسیر ہے "طوبیٰ للغرباء" کی۔ کیا اس سے بڑھکر بھی معیار کی اور کامرانی حیات کی کوئی معراج ہو سکتی ہے؟ اور کیا اس سے آگے بھی انسانی فلاح و سعادت کی کوئی منزل ہے؟ اگر کہتے ہو کہ ہے تو تاریخ کے محفوظات میں اس کی جستجو عبث ہے۔ دنیا اس غریب تعلیم کی صداقتوں سے انکار کرے لیکن اسکے پیدا کردہ اثر و انقلاب اور بخشی ہوئی عزت و سعادت کا انکار کس طرح کر سکتی ہے؟

یہ زمانہ تھا اسلام کے غلبہ اور تفوق کا۔ کچھ عرصہ تک تو اسے غلبہ کامل طور سے حاصل رہا اور جاہلیت بالکل ہی مغلوب و نامراد ہو گئی۔ پھر ایک طویل عرصہ تک بحیثیت مجموعی اسلام کو

یہ تعویق حاصل رہا اور جاہلیت ہاتھ سے نکلے ہوئے میدان کو آہستہ آہستہ دوبارہ حاصل کرنے میں لگی رہی۔ شکست کھا کر ہمیشہ کیلیے ہمت ہار کر بیٹھ جانا اس کیلیے مشکل تھا، اسلام مرجاتا گویا شیطان کا مرجانا تھا، اور جبکہ شیطان قیام قیامت تک خیر و شر کا معرکہ گرم رکھنے کیلیے چھوڑ دیا گیا ہے، تو کیونکر ممکن تھا کہ اسلام وجاہلیت کا معرکہ اتنے جلدی ختم ہو جاتا۔ اسلام کی زبردست ٹکر سے وہ کچھ عرصہ کیلیے بیہوش ضرور ہو گئی تھی، مگر مری نہ تھی۔ جو نہی کہ اس کو ہوش آیا، اس نے اپنے حریف کی حکومت کے خلاف بغاوت پر کمر باندھ لی اور جذبات و خواہشات نفس کی زہریلی گیس دماغوں میں پہنچا پہنچا کر قوائے عقیدہ کو ماؤف کرنا شروع کر دیا۔ اس کی یہ جوابی حرکت تیس برس کے بعد ہی شروع ہو چکی تھی، یعنی اس ذہنی انقلاب کا آغاز ہو گیا تھا جسکی پیشین گوئی "وسیعود غریباً" کے الفاظ میں کی گئی تھی۔

پہلے تو دماغوں سے وحدت قومی کی اہمیت فراموش ہونی شروع ہوئی۔ خلافت راشدہ کا دور ابھی ختم بھی نہ ہوا تھا کہ اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰهِ کی آڑ لیکر خوارج کا ایک الگ فرقہ وجود میں آیا۔ چند سال بعد تشیع کا فتنہ اٹھا، اس کے بعد جو لمحہ آتا گیا تفرق اور تشتت کا ایک نیا پیام لیکر آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے شیرازۂ ملت کے سیکڑوں ٹکڑے ہو کر بکھر گئے۔ مسلمان کی تلوار مسلمان ہی کے خون سے سیراب ہونے لگی۔ اسلام کے نام لیوا صنم جاہلیت کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ اس کے اشارے سے خود اہل ملت ہی نے اتحاد ملت کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا اور اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ کا ربانی شعار قومی ترک کر کے انہوں نے اَعِزَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ کے جاہلی شعار کو قبول کر لیا۔ یہ سب کچھ اس قرآن کے پیروؤں نے کیا (اور شاید بعضوں نے حمایتِ حق اور خدمت اسلام سمجھ کر کیا) جس نے اختلاف و افتراق کو بغی اور شرک کا نشان قرار دیا تھا۔ انہوں نے اسلامی قومیت کی روح حیات کو اپنے چند

سیاسی، جزئی اور اجتہادی مسائل کے بدلے بیچ دیا درانحالیکہ ایک نبی (ہارون علیہ السلام) نے اپنی قوم کو محض اس لیے گوسالہ پرستی سے روکنے میں تامل کیا تھا کہ مبادا اس میں پھوٹ نہ پڑ جائے۔ لیکن اسلام کے نادان دوستوں نے حق کے نام پر وہ سب کچھ کر کے رکھ دیا جو شاید اس کے خونی دشمنوں سے قیامت تک سرانجام نہ پاتا۔

اس کے بعد جاہلیت نے اسلامی نظریۂ خلافت پر یورش کی اور اسے ملوکیت میں بدل کر رکھ دیا۔ حکومت آبائی وراثت بن گئی۔ اقامتِ عدل کے بجائے نفس پروری اور جاہ طلبی اس کی مقصود قرار پائی، اور بنو امیہ اور بنو ہاشم کی رقابت کی دبی ہوئی چنگاریوں نے بھڑک کر قومی و نسلی عصبیت کی وہ مہیب بجلی تیار کی جس نے اسلامی نظامِ خلافت کو جلا کر ہمیشہ کیلیے خاکستر بنا دیا۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ منحوس انقلاب ہزار ہا تربیت یافتگانِ فیضِ نبوت کی موجودگی میں برپا ہوا تو ہماری عقل اسلامی نظریۂ حکومت کی بلندی اور عظمت پر حیران رہ جاتی ہے کہ یہ اپنے قیام و بقا کیلیے کتنی زبردست اخلاقی طاقت اور اجتماعی تزکیۂ نفس چاہتا ہے۔

جب اسلامی نظام کے یہ دو ستون ہل گئے تو پھر جاہلیت کی تخریبی مساعی کا زور آہستہ آہستہ بڑھتا گیا اور اس نے ایک ایک کر کے اسلامی تصورات کو دبانا شروع کیا۔ انتظام حکومت میں عجمی تخیلات کام کرنے لگے۔ نومسلموں پر جزیہ لگایا گیا۔ ایوانِ خلافت شدّاد کا محل بن گیا، تقویٰ اور دیانت کے ساتھ ساتھ احکامِ دین کی معرفت بھی خلافت کے شرائط اور فرائض میں سے نکال دی گئی، جہلا خلیفۃ اللہ اور ظل اللہ بننے لگے۔ کچھ دن اور گزرے تھے کہ نظریاتِ قرآنی کی خلاف ورزی کی پاداش میں اسلامی حکومت جو اپنی روحانی اسپرٹ پہلے ہی کھو چکی تھی ـــــ اپنی مادی شوکتوں سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی۔ مذہب کے ساتھ ہی حکومت کے بھی تار تار الگ ہو گئے، مرکزیت ختم اور طوائف الملوکی کی لعنت پوری قوم پر مسلط ہو گئی۔

خلافت اسلامی نام کے لحاظ سے ایک رہی لیکن عملاً ہندوستان سے لے کر بربر اور اندلس تک متعدد خلافتیں یعنی ملوکیتیں قائم ہوگئیں، امراء نے اعلاء کلمتہ اللہ اور اقامت عدل کے بجائے ملک گیری اپنا مقصد جنگ قرار دے لیا اور اسلامی اصول و نظریات کی تبلیغ و اشاعت کے بجائے مال و زر کی ہوس ان سے تلوار اٹھوانے لگی۔ اسلامی روح جہاد سرد پڑ گئی۔ بت شکن بت فروش بن گیا، اور آسمانی بادشاہت کے کفن بردوش سپاہی میدانِ جہاد سے بھاگ کر دنیا طلبی کے خرابات میں معتکف ہوگئے جہاں نفس و جاہلیت کی زندگی اور عقل و اسلام کی موت تھی۔

ایک طرف سے امت مرحومہ اس سیاسی اور مادی زوال آفریں انقلاب سے دوچار ہوئی، اور دوسری جانب سے فکری و علمی انقلاب اس کیلیے ایک اور تباہی لیکر رونما ہوا۔ ابھی قرآن کی رہنمائی میں مسلمانوں نے تحقیق و اجتہاد اور اکتساب علم کی چند ہی صدیاں گذاری تھیں کہ انھوں نے اپنے اوپر غور و فکر کا دروازہ بند کرلیا، اور یہ سمجھ لیا کہ اب دنیا اپنے آخری مرکز پر پہنچ گئی ہے، قرآن کے سینے میں علم و حکمت کے جتنے خزانے محفوظ تھے سب کے سب تین چار سو برس میں نکالے جاچکے ہیں، اب اس کے آگے تفقّہ اور تفکّر کی کوئی گنجائش باقی نہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جاہلی افکار اور تخیلات نئے نئے لباس میں پیدا ہوتے رہے اور دنیا ان کے سیلاب میں بہتی گئی، لیکن مسلمان اسلامی نظریات کو زمانہ کے مطابق پیش کرکے اس عالم گیر سیلاب کو ذہنیتوں پر چھا جانے سے نہ روک سکے۔ دنیا میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے گئے، تمدن آگے بڑھا، سیاست نے رنگ بدلا، علوم کی متعدد شاخیں پھوٹیں، تحقیق و جستجو نے کائنات کے عجیب عجیب اسرار کھولے، ٹھیری ہوئی زمین متحرک ہوگئی، کھوج لگانے والوں نے ایک نئی دنیا ڈھونڈھ نکالی، مگر وائے افسوس مسلمان جمود کی تاریکی میں غفلت

کی نیند سوتے رہے اور زمانہ کا کاروان برق رفتار ان کو سوتا چھوڑ کر صدیوں آگے نکل گیا۔ پھر جب وہ خود ہی دنیا کی امامت اور رہنمائی سے استعفا دے چکے تھے تو قدرت دوسروں کو ان کی جگہ کیوں نہ بخش دیتی؟ جہاد اور اجتہاد یعنی جوش عمل اور روح تحقیق، دونوں سے یہ خالی ہو چکے تھے، ان کا قلم شکستہ اور انکی تلوار زنگ آلود ہو گئی تھی اور سیاسی و ذہنی دونوں حیثیتوں سے یہ قوم اس قابل نہ رہی تھی کہ دنیا کی امامت کر سکے اور زمانہ کی رفتار کو اپنے قابو میں رکھ سکے۔ اب انکی خاطر پیشوائی کا منصب کھلا اور کب تک خالی رہتا؟ دوسرے اٹھے انہوں نے اصول جاہلیت پر اجتہاد کیا، اور راہ طاغوت میں جہاد کیا۔ یہاں تک کہ وہ انہی چیزوں کو لیکر دنیا کے پیشوا بنتے چلے گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا اور یہی ہونا تھا کہ اسلام کا سیاسی اور فکری اقتدار گھٹنے لگا اور اسکی جگہ جاہلیت کی حکمرانی دماغوں اور جسموں پر قائم ہونے لگی۔

اگرچہ بحیثیت مجموعی جاہلیت پانچ چھ سو برس بعد ہی اسلام پر غالب آگئی تھی مگر اسلام کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایک طویل مدت تک بالکل مغلوب یعنی مکمل "غریب" نہ ہو سکا۔ اگرچہ یونانی نظریات، ایرانی خیالات اور ہندی تصورات نے اثر ڈال کر اس کی طاقتور روح کو مجروح بنانا شروع کر دیا تھا، مگر ایک تو ان غیر قرآنی افکار و تخیلات کی پشت پر کوئی مادی قوت نہ تھی، دوسرے قرآن کے اصول خود اپنے اندر صحت و توانائی کا کامل وصف رکھتے تھے، اس لیے ابتدائی حملے کچھ بہت زیادہ کارگر نہ ہوئے۔ اس دوران میں تین چار صدیوں تک — جبکہ مسلمانوں کے اندر جہاد و اجتہاد، دونوں کی روحیں سرد پڑی تھیں — کوئی مرد میدان اس قوت اور عزیمت کا بھی نہ اٹھا جو مسلمانوں کی خالی کی ہوئی مسند امامت پر فوراً قابض ہو جاتا اور اپنے سیاسی استیلاء سے دنیا کے افکار و خیالات پر اپنا غیر اسلامی تسلط جما لیتا۔ اس وجہ سے اسلامی اصول و نظریات کا جو صور صدر اول کے مسلمانوں نے اتنی بلند آہنگی

سے پھونکا تھا، اس سیاسی پستی کے باوجود اس کی صدائے بازگشت کے فضائے عام میں گم ہوتے ہوتے بھی صدیاں گذر گئیں اور جاہلیت اپنی کامل فتحمندی کی آرزوؤں سے ہمکنار نہ ہو سکی۔

لیکن چار سو برس کی اس طویل مدت میں جبکہ مسلمان اپنے اسلاف کے بچھائے ہوئے بستر پر آرام سے سو رہے تھے، افق مغرب پر ایک زبردست انقلاب کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور حریت فکر اور علم و حکمت کی جو چند کرنیں خود مسلمانوں نے اس افق تک پہنچا دی تھیں وہ بڑھتے بڑھتے ایک عظیم الشان آفتاب بن رہی تھیں۔ آخر کار جب حوادث روزگار کے تازیانوں نے ان مدہوشوں کی آنکھیں کھولیں تو انھوں نے دیکھ لیا کہ جو سورج کبھی مشرق کے افق سے نکلا تھا وہ آج مغربی افق سے نکل رہا ہے، صرف نکل ہی نہیں رہا ہے بلکہ وسط آسمان پر چمک رہا ہے، اور ساری دنیا اس کی تیز نگاہی سے مرعوب ہے، اور سب ھٰذَا رَبِّي ھٰذَا اَکْبَرُ کہکر اس کے سامنے جھکے جا رہے ہیں، اور تمام کے تمام خواہ وہ اپنے کو مسلمان کہتے ہوں یا کچھ اور، زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ آج جاہلیت کی فتح کامل ہو گئی اور جو مہم اس نے پہلی صدی ہجری کے وسط میں اسلام کے خلاف شروع کی تھی وہ بارہویں صدی میں آکر اپنی کامرانی کے آخری نقطہ پر پہنچ گئی اور وہ وقت آگیا جو "سیعود غریبا" کے مکمل ظہور کا وقت تھا۔

حرماں نصیبیِ عقل و اسلام کی یہ کتنی دلدوز داستان ہے کہ علم و حکمت اور آزادی فکر و رائے کے جو ہتھیار اس نے یورپ کو دیے تھے تاکہ وہ ان سے اپنی صدیوں کی جہالت کا مقابلہ کرے، اس نے انجام کار ان ہتھیاروں کا تختۂ مشق اسلام ہی کو بنا لیا اور جب وہ مسلمانوں کی خالی کی ہوئی جائے امامت پر آیا تو اسلامی نظریات اور تعلیمات سے مانوس

اور معتقد ہونے کے بجائے بالکل ہی اس سے متوحش اور بیگانہ تھا۔ اس کی وجہ سمجھنے کیلیے
آپ کو یورپ کے ذہنی و فکری انقلاب یعنی اسکی نشاۃ ثانیہ کے ابتدائی دور پر ایک نظر ڈالنی چاہیے
یہ تو مسلّم ہے کہ یورپ کی تاریک روح کو اسلامی فکر کی روشن اور ہمہ گیر کرنوں ہی نے منور کیا
اور کلیسائی اوہام و خرافات کی غلام عقل کو قرآن کی حریت نواز عقلیت ہی نے آزاد کرایا۔
مگر اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ قرآنی تصورات اور نظریات کو وہ اچھی طرح
ہضم نہ کرسکا تھا۔ بلکہ محض اسکی چند موٹی موٹی باتوں کو اس نے سطحی طور پر اچک لیا تھا۔ اس کے
علاوہ صلیبی لڑائیوں اور یورپ کی مسلسل پسپائیوں نے عیسائی اقوام میں اسلام کے خلاف
تعصب اور نفرت کی ایک ہمہ گیر وبا پھیلا رکھی تھی۔ اس وجہ سے وہ علم و حکمت کے میدان میں
آگے بڑھنے کے باوجود اسلامی تصور حیات سے بیگانہ تر ہوتا چلا گیا اور اس کی ترقی کا رخ بالکل
غلط اور فطرت کش راہ پر پڑ گیا۔

سوء اتفاق سے یورپ میں مذہب کے نام سے عیسائیت پھیلی ہوئی تھی جو خود عقل و فطرت
سے برسرپیکار تھی۔ جب اسلام کے اثر سے یورپ نے اوہام کی تاریکیوں سے نکل کر فکر و نظر کی
آزاد فضا میں آنا چاہا تو مذہب عیسوی نے پوری قہرسامانیوں کے ساتھ اس آزادی کو فنا کرنے
کی کوشش کی۔ حریت پسند کافر قرار دیئے گئے، مذہبی عدالتیں قائم ہوئیں اور اس فکری و
علمی انقلاب کے علمبرداروں کو انتہائی وحشیانہ اور انسانیت سوز سزائیں دی گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ
آزادیٔ نظر کی یہ آگ دبنے کے بجائے اور بھڑک اٹھی اور چونکہ مذہب کا نام لیکر مذہبی پیشواؤں
نے اس تحریک کی مخالفت کی تھی اس لیے قوت پکڑنے کے بعد پہلے تو اس آگ نے پوپ
اور چرچ کے مقدس اقتدار کو پھونکا، پھر عیسائیت کی خبر لی اور آخر میں نفس مذہب اور
مذہبیت کو جلا کر رکھ دیا، کیونکہ اس مخالفت نے یہ تخیل پیدا کر دیا تھا کہ علم و حکمت عین ضد ہے

مذہب کی، اس لئے جب تک راستہ کا یہ پتھر نہیں ہٹتا علم کے میدان میں ہم آگے نہیں جا سکتے۔ اور چونکہ مذہب کی بنیاد خدا اور قانون مجازات کے اعتقادات پر ہے، اس لیے جوشِ انتقام میں انہوں نے دشمنوں کی اس یادگار کو بھی مٹا دینے کی ٹھان لی اور الٰہی نظریہ سے بالکل آزاد ہو کر اسرار کائنات کی گتھی سلجھانے لگے۔

اس طرح مغربی فلسفہ و سائنس نے "نیچریت" (Naturalism) کی داغ بیل ڈالی۔ اگرچہ سترہویں صدی تک وہ اپنے اس جدید رجحان کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے تھے اس لیے نیچریت کے ساتھ ساتھ خدا پرستی اور مذہبی اخلاق کو بھی نباہنا چاہتے تھے لیکن یہ دو کشتیوں کا سفر زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا تھا اور نہ رہا۔ آخر کار اٹھارہویں صدی میں ہولباخ، لامیٹری، مانٹسکیو اور روسو وغیرہ آزاد خیال فلاسفہ نے اس ذہنی انقلاب کے رخ کو قریب قریب بالکل مادّہ پرستی کی طرف پھیر دیا۔ انیسویں صدی میں یہ مادّیت اپنے کمال کو پہنچ گئی اور آزاد خیالی اور عقلیت کی عدالت میں کسی ما فوق الطبیعت ہستی کے اعتقاد سے بڑھکر کوئی عظیم گناہ نہ رہا۔ پھر ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء نے اور اس نظریہ کی ترجمان کتاب اصل الانواع (Origion of species) نے جو ۱۸۵۹ء میں شائع ہوئی تھی، اس نظریۂ مادیت کو ایسا استحکام بخشا کہ گویا وہ ایک ناقابل انکار سائنٹفک حقیقت ہے۔ اسی نظریہ کے پیٹ سے یورپ کا موجودہ نظام سیاست، اس کا نظام تہذیب و تمدن، اسکے اصول معاشرت، اسکے اخلاقی تصورات اور اسکے معاشی نظریات پیدا ہوئے۔ اشتراکیت کا برگ و بار بھی اسی اصل سے پھوٹا۔ امپیریلزم، اور ظالمانہ سرمایہ داری، اور فاشزم کو بھی اسی نے جنم دیا۔ غرض دنیا کا سارا نظام زندگی، خدا پرستی اور عقل و فطرت کے صحیح تصورات کے بجائے نفس اور حیوانیت کے مقتضیات پر قائم ہوگیا، اور آج یورپ اور اس کے غلام ایشیا میں

علی الاعلان ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے کہ روح کا مستقر نہ دل ہے نہ دماغ بلکہ معدہ اس کا مستقر ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے شہوات کی تحریک سے ہوتا ہے۔ فکر و نظر اور تمیز و ارادہ سب اُن مراکز تحریک کے تابع ہیں جو پیٹ اور اسکے حوالی میں واقع ہوئے ہیں! رہی عقل تو اس کا فریضہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ وہ شہوات کیلئے ایک باتدبیر خادم کا کام دے، چنانچہ پروفیسر جوڈ اپنی کتاب گائڈ آف ماڈرن تھاٹ (Guide of modern thought) میں صاف کہتا ہے کہ:

"عقل درحقیقت ہماری خواہشات کی لونڈی ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ جو مقاصد ہم غیر شعوری طور پر متعین کریں وہ ان کے حصول کیلیے ذرائع بہم پہنچائے اور جو کچھ ہم کرنا چاہیں اس کے جواز کیلیے دلائل مہیا کردے۔"

اور ڈارون یہ ثابت کرہی چکا ہے کہ انسان ایک اعلیٰ درجہ کا ترقی یافتہ حیوان ہے، اس لیے لا محالہ اس کی سعادت اور خوش نصیبی کا کمال بس یہی ہے کہ اپنے نفسانی اور حیوانی مقتضیات کو پورا کرنے کیلیے زیادہ سے زیادہ اسباب و وسائل اور لذیذ سے لذیذ طریقے ایجاد کرے!

یہ ہے اس یورپ کے نزدیک معیار فطرت و انسانیت، جو آج بلا شرکت غیرے پورے کرۂ ارض پر امامت کے فرائض انجام دے رہا ہے، اور اسی نقطۂ نظر کا ڈھالا ہوا ہے وہ نظامِ حیات جو اس کے قلم اور تلوار کے زور سے ساری اقوام عالم کے تہذیب و تمدن، معیشت و معاشرت اور اقتصاد و سیاست پر، نیز انکے افکار و تصورات پر حکمرانی کر رہا ہے۔ اس کا مل قلب ماہیت اور فساد مذاق کے بعد کیا تمہیں توقع ہے کہ وہ ان اسلامی تصورات اور نظریات سے وحشت اور بیگانگی نہ محسوس کرے گا جو خالص عقل، بے آمیز فطرت اور بے داغ انسانیت کی بنیادوں پر قائم ہیں، اور جن کا خمیر نفسانیت اور حیوانیت کے عناصر سے بالکل پاک ہے؟ کیا تم امید رکھتے ہو کہ یہ پیٹ اور شہوت کی غلاظتوں میں لوٹنے والا کیڑا اگر فضائے آسمانی

کی غیر مرئی بلندیوں تک اڑنے لگا یا سمندر کی متلاطم لہروں کو چیرتا ہوا چلنے لگا تو یہ قرآنی افکار ونظریات کی بلندیوں اور گہرائیوں تک بھی پہنچ سکتا ہے؟ پھر کیا تمہیں یہ یقین ہے کہ قرآن کی اُس روشنی کو جسے کبھی ساری دنیا نے روشنی سمجھا اور عقل و فکر کے بجھے ہوئے چراغوں کو اسی سے روشن کیا تھا، آج بھی وہ دنیا اس روشنی کو روشنی ہی سمجھ رہی ہے؟ اگر یہ بات نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو بس سمجھ لو کہ "سیعود غریبًا" کا منحوس دور اسلام پر مسلط ہو چکا، جاہلیت پوری طرح انسانی اعمال و افکار پر چھا چکی، اسلام "غریب" بن کر کس مپرسی کی اوٹ میں چھپ چکا۔ قرآن کے ساتھ جو بے انصافی اب سے ۱۳۰۷ برس پہلے ہوئی تھی وہی اب پھر ہونے لگی ہے۔ اس کی تعلیمات کی اساس جن بلند اور حکیمانہ تصورات پر رکھی گئی ہے ان کی سمائی جس طرح ساتویں صدی عیسوی کے تنگ دماغوں میں نہ ہوتی تھی اسی طرح آج بیسویں صدی کے مدعیٔ وسعت دماغوں میں بھی نہیں ہوتی۔ دنیا کی عقل اتنے اکتشافات اور تحقیقات کے باوجود اُن بلند حقائق سے وہی اجنبیت اور نامانوسیت محسوس کر رہی ہے جو جاہلیت اولیٰ نے محسوس کی تھی۔ اسکی شپرہ چشمی اب بھی اس آفتاب حق کو تاریک ہی دیکھ رہی ہے۔ یہی اسکی بدبختی کا راز کل ہے، اور یقین کرو کہ اس بدبختی کے ذمہ دار صرف یورپ کے ائمۂ کفر ہی نہیں ہیں خود ہم بھی ہیں۔ بلکہ صحیح تر یہ ہے کہ اگر ہم جاہلیت کے آگے سرنگوں نہ ہوتے تو دوسرے بھی نہ ہوتے۔ اگر ہم خود "سیعود غریبًا" کی پیشنگوئی پوری نہ کرتے تو دنیا اس ظلمت میں مبتلا نہ ہوتی۔ اگر خود ہمارے اعمال و افکار سے روح قرآنی نہ نکل جاتی تو دوسرے بھی آب حیات کو زہر نہ سمجھتے۔ لیکن ملہم غیب کی پیشین گوئی پوری ہونے والی تھی، پوری ہو کر رہی، اور جاہلیت کے خس و خاشاک نے اسلام کے چشمۂ حیوان کو نگاہوں سے بالکل اوجھل کر کے ہی چھوڑا۔ اگر مغرب اس سے بیگانہ ہے تو مشرق کب اسکا محرم ہے؟ یہ میرا اپنا دعویٰ نہیں بلکہ حالات اور واقعات کا اعلان ہے اور جاہلیت جدیدہ خود اس اعلان کی تصدیق کرتی ہے۔ (باقی)

"مسلمان قوم ہیں یا فرقہ"

از جناب نذیر احمد صاحب قریشی - دہلی

ترجمان القرآن جلد ۱۱ عدد ۲ صفحہ ۹۵ تا ۱۴ پر ایک مضمون بعنوان "مسلمان قوم ہیں یا فرقہ" از جناب عزیز ہندی شائع ہوا ہے، جسکے پڑھنے سے مجھے کچھ شبہات اور اعتراضات پیدا ہو گئے ہیں۔ چونکہ یہ خالص علمی اور بہت ہی مفید بحث ہے اس لیے میں اپنے اعتراضات کو ذیل میں درج کرتا ہوں۔

جناب عزیز ہندی نے نہایت صاف طور پر اپنا موضوع لکھ دیا ہے کہ "مسلمان قوم ہیں یا فرقہ" اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ مسلمان قوم ہیں نہ کہ فرقہ۔ اس نتیجہ سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ مگر "قوم" ثابت کرنے کیلیے جو استدلال انھوں نے پیش کیا ہے ہمیں علمی حیثیت سے اس پر اعتراضات ہیں۔

مضمون عالمانہ اور فلسفیانہ انداز میں لکھا گیا ہے۔ "قوم" کا مفہوم یورپ کی اصطلاح "نیشن" سے لیا گیا ہے۔ سیاسی مسائل میں شاید ہی کوئی ایسا مسئلہ ہو جیسا کہ مسئلہ "قومیت" کا جس پر اسقدر بے اصولانہ اور غیر مربوط فکر و تخیل پیش کیا جا رہا ہے۔ اور بغیر سوچے سمجھے ایسے اہم موضوع پر قلم اٹھایا جا رہا ہے۔

(۱) فاضل مضمون نگار ایک قاعدہ کلیہ بیان فرماتے ہیں جو ذیل میں درج ہے۔

"اپنا الگ مسلک اور الگ طریق زندگی رکھنا ہی کسی جماعت کا ایک الگ قوم ہونا ہے"

"الگ مسلک" اور "ایک طریق زندگی" ایسے مہمل، مبہم اور گول مول الفاظ ہیں کہ ان سے کسی کلیہ یا اصول کا پتہ ہی نہیں چلتا کہ وہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ان دونوں باتوں کے اجتماع سے "الگ قوم" بن جائے۔ ہم کوشش کرینگے کہ قوم کے اجزائے ترکیبی کو بیان کریں۔

"قوم" دراصل مرکب ہوتی ہے دو بڑے اجزاء سے۔ انمیں سے ایک اسکی حیثیت سیاسی ہے، دوسری کیفیتِ نفسی جو خاص خاص قوانین کے ماتحت پیدا ہوتی ہے، ترقی پاتی ہے اور زوال پذیر ہوجاتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ حیثیتِ سیاسی قوم کی تشکیل کے وجود کا ظہور خارجی ہے۔ اور کیفیتِ نفسی وجود اندرونی ہے۔

قوم کے سیاسی یا خارجی وجود کا تجزیہ اب ہم "نیشن" کی حیثیتِ سیاسی کا تجزیہ کرینگے تاکہ معلوم ہو سکے کہ "قوم" کے اجزائے ترکیبی میں ان کا دخل کہاں تک ہے۔ قوم چار قسم کی ہوسکتی ہے:

(الف) بسیط (Simple)

(ب) مخلوط (Complex)

(ج) مرکب (Compound)

(د) ممزوج (Hybrid)

(الف) بسیط قوم "نیشن" کا مکمل ترین نمونہ سمجھی جاتی ہے۔ اس سے مراد ہے وہ گروہ انسانی جسکی زبان، نسل، مذہب، تمدن اور جغرافی حدود ایک ہوں۔ اس قسم کی قوم کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔ آئیس لینڈ میں اس قسم کی قوم آباد ہے، اور ملک حجاز کی تمام آبادی پر اسی قومیت کا اطلاق ہوتا ہے۔ اٹلی کے مشہور انقلابی لیڈر میزنی کا "نیشن"

کے متعلق یہی تخیل تھا۔

(ب) مخلوط سے مراد وہ گروہ انسانی ہے جسمیں مختلف فرقے، نسلیں، اور مذاہب کسی سیاسی مقصد کیلیے متحد ہو جائیں جسکی مثال انگلستان اور ہنگری ہے۔

(ج) مرکب سے ایسی قوم مراد لی جاتی ہے جسمیں کئی قومیں اپنی الگ قومی حیثیت رکھتی ہیں یہ صرف وفاقی طور پر متحد ہوتی ہیں، جیسے آسٹریا (قبل از جنگ)۔ سوئیٹزرلینڈ۔ کینڈا۔

(د) ممزوج سے انسانوں کا ایسا گروہ مراد ہے جو زبان، نسل اور جغرانی حدود کے الگ الگ ہونے کے باوجود کسی اپنے خاص واحد مذہبی نظام کے ماتحت متحد ہو، اور سیاسی طاقت کا بھی حامل ہو۔ یہی وہ قسم ہے جو مسلمان قوم کیلیے مخصوص ہے۔

انسانی جماعتوں کے ساتھ ساتھ انسانی حقوق کے جلب و اخذ کا بھی سوال پیدا ہو جاتا ہے لیکن یہ موضوع ہماری بحث سے خارج ہے اس لیے ہم اس کی تفصیلات میں نہیں پڑتے۔

قوم کی کیفیتِ نفسی کا تجزیہ "قوم" کا اندرونی وجود اسکی نفسی کیفیات ہیں جن کی تشریح علم النفس کے اہم موضوع "نفسیات اجتماع" سے ہو سکتی ہے۔ ذیل میں ان کا تجزیہ مختصراً کیا جاتا ہے۔

(۱) قانون اشتراکیتِ مسلسل (The law of continuous co-operation) جس کے ذریعہ سے مختلف وقتی عناصر ایک مقناطیسی قوت کے گرد جمع و متحد ہو جاتے ہیں۔ یہ قانون ایک قسم کی برقی رو کے ذریعہ تمام افراد قوم میں سرایت کر جاتا ہے اور اسی کے ماتحت جذبۂ اخوت پیدا ہو جاتا ہے۔

(۲) دوسرا قانون خطرات مشترکہ ہے (Commondanger) مذکورۂ بالا قانون کے تحت جو افراد باہم مربوط ہوتے ہیں ان کو مشترک خطرات سے حفاظت کا تخیل

اور زیادہ پیوست کر دیتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ حبِ وطن ایک بہت بڑی طاقت ہے اور "قومیت" اسی کی پیداوار ہے، لیکن اس کی بنیاد دراصل مشترک خطرہ ہی پر ہوتی ہے اس خطرہ سے حفاظت کا تخیل قوم میں سرایت کرتے ہی تیسرا نفسیاتی قانون کام کرنے لگتا ہے جو اسی کی پیداوار ہوتا ہے۔

(۳) اشتراکِ ایثاری (Sacrificial co-operation)۔ اس سے مراد یہ ہے کہ مشترک خطرہ پیش آنے پر تمام افرادِ قوم میں ایثار و قربانی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس جذبہ کا زور ان میں ایک زبردست اتصال پیدا کر دیتا ہے۔ یہ ایک مسلّم اصول ہے کہ جب قوم اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے اور اپنے حدود خون کی لکیروں سے کھینچ لیتی ہے تو باقی تمام مدارج آسانی سے طے ہو جاتے ہیں[۱]۔

---

[۱] ترجمان القرآن۔ فاضل نقاد نے قوم کی کیفیاتِ نفسی کا یہ تجزیہ تمام تر مغربی مصنفین سے نقل کر لیا ہے، اور مغربی مصنفین پر جو مادّی نقطۂ نظر مستولی ہے اسی کو ناواقفی میں وہ بھی اختیار کر گئے ہیں۔ حالانکہ سب سے پہلے انہیں خود ان نظریات ہی پر تنقیدی نظر ڈالنی چاہیے تھی۔ اہلِ مغرب کے افکار میں یہ غلطی بطور اساس پائی جاتی ہے کہ وہ مادّی طاقتوں کو اصل اور روحی و نفسی طاقتوں کو فرع سمجھتے ہیں، اور ہمیشہ عالمِ باطن کی کیفیات کا سراغ عالمِ خارجی یا عالمِ مادّی کے محرکات ہی میں تلاش کیا کرتے ہیں۔ ان کے تمام نظریات اسی مادّہ پرستانہ رجحانِ نفس پر مبنی ہیں، اور یہ رجحانِ نفس فی نفسہٖ کوئی سائنٹفک حقیقت نہیں ہے جسکو چار و ناچار ماننا ہی پڑے، بلکہ یہ دراصل ایک غیر عقلی رجحان ہے جو دلیل کے بغیر پیدا ہوتا ہے، اور پھر اسکی تائید میں آثار و شواہد کو سائنٹفک طریقہ پر مرتب کرکے استدلال کی ایک نظر فریب عمارت کھڑی کر دی جاتی ہے جس سے آدمی مرعوب ہو کر یہ سمجھ بیٹھتا ہے کہ جو نظریہ پیش کیا جا رہا ہے وہ ایک حقیقت واقعیہ ہے۔ یہاں اسکی تفصیل کا موقع نہیں، مگر اشارۃً ہم صرف اتنا بیان کرینگے کہ قوم کے باطنی وجود کا جو تجزیہ کیا گیا ہے، مشاہدات اسکی

اب یوں سمجھئے کہ اگر سیاسی اجزائے ترکیبی قوم میں موجود ہوں مگر نفسی کیفیات پیدا نہ ہوں تو یہ ایک غیر کیمیاوی مرکب ہے جو کسی نہ کسی وقت الگ الگ اجزا میں تقسیم ہو کر رہیگا - یعنی جب تک نفسی کیفیات کی برقی رو قوم میں سرایت نہ کر جائے اسوقت تک صحیح معنوں میں مرکب طیار نہیں ہوتا - یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ سیاسی اور نفسیاتی اجزائے ترکیبی کے امتزاج طے کرتی چلی جائیگی - ان سب اسباب کے پیدا ہو جانے کے ساتھ قانون تغیر (Law of change) بھی کام کرنے لگتا ہے، جسکے ماتحت یہ نفسیاتی کیفیات ترقی کرتی ہیں اور تنزل پذیر ہوتی ہیں اگر وہ تغیر رو بہ تنزل ہے تو قوم میں سے یہ خصائل زائل ہو جاتے ہیں، اور وہ اپنی آزادی کھو بیٹھتی ہے - ایسی مثالیں بہت ہیں کہ ایک نسل، ایک مذہب، ایک تمدن کی مالک اقوام اجنبی اقوام کی محکوم ہیں - اسلامی ممالک میں اس قسم کی مثالیں آپ کو کثرت سے ملینگی -

مندرجہ بالا مختصر میں وضاحت سے یہ بات صاف ہو گئی کہ "الگ مسلک" اور الگ طریق زندگی" رکھنا کسی جماعت کو ایک الگ قوم نہیں بناتا بلکہ اور بھی ضروری عناصر ہیں جو "قوم" بنانے میں ممد و معاون ہیں -

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۷۵ - تائید نہیں کرتے - خود ہندوستان میں قانون اشتراک مسلسل، قانون خطرات مشترکہ، اور قانون اشتراک ایثاری (تینوں کا عمل گزشتہ آٹھ صدیوں سے کام کر رہا ہے، اور مخلوط یا مرکب قومیت بنانے کیلیے بھی خارجی عناصر موجود رہے ہیں، مگر آج تک ہندو اور مسلمان کسی قسم کی بھی قوم نہ بن سکے - اس سے بڑھ کر کھلی ہوئی دلیل اس امر کی اور کیا ہو سکتی ہے کہ قوم کے وجود ترکیب ان تین نفسیاتی قوانین کے عمل اور خارجی توالیف کی فراہمی سے نہیں ہوتی، بلکہ کوئی اور چیز بطور اساس اسکے اندر موجود ہوتی ہے جسکے لیے یہ چیزیں محض مددگار دین سکتی ہیں - جناب عزیز نے دراصل "الگ مسلک" اور "الگ طرز زندگی" سے اسی اساس کی طرف اشارہ کیا تھا، جسکو دوسرے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ کسی گروہ کا ایک مستقل تہذیب، اور اس تہذیب کے زیر اثر ایک خاص تمدن رکھنا، اسکی قومیت کی اساس ہے -

(۲) جناب عزیز ایک اور نظریہ پیش کرتے ہیں جو ذیل میں درج ہے:

"اقوام کا دفعتہً چولا بدل ڈالنا تاریخ، تجربہ انسانی، اور فطرت کے آئین کے بالکل خلاف ہے۔ اس لیے متعدد اقوام ہند کا محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا نہایت ہی غیر اغلب اور ناممکن ہے۔"

جہاں تک اس نظریہ کے پہلے حصہ کا تعلق ہے کہ "اقوام دفعتہً چولا نہیں بدلتیں بالکل درست اور صحیح ہے۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ فاضل مضمون نگار نے اس سے یہ نتیجہ کس طرح نکال لیا کہ متعدد اقوام ہند کا محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا غیر اغلب اور ناممکن ہے۔ برخلاف اس کے واقعہ یہ ہے کہ متعدد اقوام ہند کا ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا نہایت اغلب اور بہت ممکن ہے۔ ہم کہیں گے کہ متحدہ قومیت میں ڈھالے جانے کا عمل ہندوستان میں بہت زور شور سے شروع ہو گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مقالہ نگار نے متحدہ قومیت پیدا ہوتے ہیں مقامی تعلق کی اہمیت کو نہیں سمجھا، اور دوسرے قوانین جو اس قومیت کے پیدا کرنے میں کام کرتے ہیں انکو بھی نظر انداز کر دیا ہے۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے، اسکو نظر انداز نہ کیجیے کہ "متحدہ قومیت" کا تخیل بھی یورپ کے سیاسی مفکرین کی جدید پیداوار ہے۔ ابتدائی زمانہ میں قوم کی بنیاد مختلف نسلوں اور جنسوں پر نہیں رکھی جاتی تھی، بلکہ قوم ایک ہی نسل کے مختلف قبیلوں اور گروہوں کے مجموعہ کا نام تھا۔ اور انسانوں کی قومیت وطن کی بنا پر تبدیل نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس زمانہ کا یہ عقیدہ تھا کہ ہر جانور جو شاہی اصطبل میں پیدا ہو یا پرورش پائے گھوڑا نہیں بن سکتا۔ جدید سائنس نے اس پرانے نظریہ کو تبدیل کر دیا ہے۔ اٹھارھویں صدی کے فلسفیوں نے جو نظریۂ قومیت پیش کیا تھا وہ بھی پرانا، فرسودہ اور بیکار سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کا قومی نظام بدل رہا ہے اور اب دنیا

ایک نیا چولا پہن رہی ہے - اٹھارویں صدی کے "وونیشن" کے تخیل کی آخری شکست جنگِ عظیم سے ثابت ہے - ہندوستان کا سیاسی میلان یورپ کے جدید نظریہ "اسٹیٹ" کی طرف ہے - اس "اسٹیٹ" کی مذہب اور قدیم تمدن سے جنگ ہے - یہ "اسٹیٹ" وطنی قومیت کی بنیادوں پر کھڑی کی جارہی ہے - اسقدر تمہید کے بعد اب دیکھیے کہ متحدہ قومیت کن کن قوانین کے ماتحت کام کرتی ہے -

(۱) سب سے پہلے مختلف اقوام میں وطنی قومیت کا احساس پیدا ہوتا ہے اور مختلف اقوام ملک کی آزادی کی خاطر ایک سلسلہ میں منسلک ہو جاتی ہیں - اس قانون کا لازمی نتیجہ وطنی عصبیت کے جذبہ کا پیدا ہوتا ہے - وہ تمام فرقے یا اقوام جو اس وطنی قومیت میں شامل نہیں ہوتے اُن کے خلاف وطنی تعصب پیدا ہو جاتا ہے اور ان کو ذلیل و خوار سمجھا جانے لگتا ہے - جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس وطنی قومیت کی بنا بھی مشترکہ خطرہ ہے - اور اسکی انتہا دوسری اقوام پر حملہ کرنے کا جذبہ ہوتا ہے -

(۲) یہ ایک جارحانہ جذبہ (Aggressive Attitude) ہے - جو فرقے یا قومیں متحدہ قومیت کے دائرہ میں شامل نہیں ہوتیں ان پر ظلم کرنے کے خصائل متحدہ قومیت میں پیدا ہو جاتے ہیں اور یہ چیز بھی متحدہ قومیت پیدا کرنے میں مدد کرتی ہے، جیسا کہ روس میں ہوا -

(۳) تیسری چیز نفسیات ترغیب ہے - اور یہ حربہ نئی نسلوں پر استعمال کیا جاتا ہے - موجودہ نسل کو جارحانہ تدابیر سے مرعوب اور منکوب کر دیا جاتا ہے تاکہ وہ دب کر رہ جائیں - اور آئندہ نسل کو ترغیبی تدابیر سے اس طرح متاثر کیا جاتا ہے کہ وہ متحدہ قومیت کی حامل بن کر اٹھیں -

(۴) چہارم قانون تغیر کا سب سے بڑا جزو "طاقت" ہے - اگر متحدہ قومیت کی تحریک طاقت کی مالک ہو تو وہ کمزور اقوام کو اپنے میں جذب کر لیگی - لیکن اگر مستقل قومیتیں طاقتور ہوں

تو متحدہ قومیت کی تحریک فنا ہو جائیگی ۔

جب یہ چاروں اجزا تحریک آزادی کی بھٹی میں پگھلائے جاتے ہیں تو ایک نیا مرکب طیار ہوجاتا ہے جسکا نام متحدہ قومیت ہے ۔ فلاسفہ کا خیال ہے کہ جب یہ چاروں عنصر کام کرنے لگتے ہیں تو تیسری پشت میں متحدہ قومیت پیدا ہو جائیگی جو پہلی اقوام سے بالکل ایک مختلف چیز ہوگی ۔ ان قوانین کے جاری اور ساری ہو جانے پر ماحول اور دیگر اسباب کے مطابق ممکن ہے قسم (الف) کی قومیت قسم (ب) کی قومیت میں تبدیل ہو جائے اور (ب) (ج) میں تبدیل ہو جائے ۔ اور یہ تغیر کچھ زیادہ عرصہ میں رونما نہیں ہوتا بلکہ بہت جلد عمل پذیر ہو جاتا ہے ۔ البتہ (د) کی قسم میں تبدیلی ذرا دیر میں واقع ہوتی ہے جسکی مثال مسلمان قوم ہے ۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ اٹھارہویں صدی سے یورپ میں انقلابات رونما ہو رہے تھے اور یورپین اقوام ان کو جلد از جلد قبول کرتی جا رہی تھیں ۔ لیکن عثمانی ترکوں میں ایک بہت بڑے عرصہ کے بعد یہ انقلاب اثر پذیر ہو سکا ۔

ذرا تاریخ عالم پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ امریکہ میں یونانی، اطالوی، فرانسیسی، جرمنی، بلغاری وغیرہ اقوام سے کس طرح امریکن قوم پیدا ہو گئی ۔ یہ قوم صرف نفسیات ترغیب کے ذریعہ پیدا کی گئی ہے ۔ امریکہ کے اسکولوں اور کالجوں میں نئی نسلوں کو متحدہ قومیت کی تعلیم دی گئی جہاں سے نئی نسلیں امریکن قومیت کا جامہ پہن کر نکلیں ۔ ہندوستان میں بھی دو جدید تعلیمی اسکیمیں اسی مطلب کیلیے طیار کی گئی ہیں (وردھا اسکیم اور ودیا مندر اسکیم) ۔

اگر روس میں جہاں تقریباً اڑتالیس مختلف اقوام آباد ہیں، اکثر اقوام کی مرضی کے خلاف متحدہ قومیت پیدا کی جاسکتی ہے تو وہ کونسی ایسی رکاوٹیں ہیں جنکی وجہ سے ہندوستان میں جدید متحدہ قومیت پیدا کرنا غیر ممکن ہو ۔ روس میں تعلیم اور جبر دونوں حربے استعمال کیے جا رہے ہیں،

اور یہاں بھی متحدہ قومیت کی تحریک، حکومت کے اقتدار سے مسلح ہو کر اپنی حربوں کو استعمال کر سکتی ہے اور کر رہی ہے۔

میرے ان خیالات سے یہ نہ سمجھا جائے کہ میں متحدہ قومیت کا حامی ہوں سوال صرف یہ ہے کہ اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت کانگرس جس نوعیت اور طریق سے ملکی آزادی کے ہیجان پر سے مسلمانوں کو متحدہ قومیت کا شکار بنا رہی ہے اس سے بچنے کا کیا طریقہ ہے۔ اگر ہم یہ سمجھ لیں کہ متحدہ قومیت بننا غیر ممکن ہے تو ہم مطمئن ہو کر بیٹھ جائینگے۔ اور اگر یہ جان لیں کہ متحدہ قومیت بنائی جا سکتی ہے، اور زمانۂ قریب میں ہماری اسلامی قومیت کا مٹ جانا اغلب ہے، تو البتہ ہم چوکنے ہو کر اس سے بچنے کی کوشش کرینگے۔

جیسا کہ میں اوپر بیان کر چکا ہوں مسلمان قسم (د) کے تحت میں آتے ہیں، یعنی ان میں کسی نئے نظام کو فوراً تسلیم کر کے جلدی تغیر رونما نہیں ہوتا۔ دہمیں اسکی مثالیں دینے کی ضرورت نہیں ہے آپ ہندوستان میں مسلمانوں کی قوم پر نظر ڈالیں آپ کو یہ اصول ہر جگہ کام کرتا ہوا نظر آئیگا۔ سرسیدؒ کو بھی اسی اصول سے مقابلہ کرنا پڑا تھا) مگر آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ متحدہ قومیت میں شامل ہی نہیں ہو سکتے۔ ترکی اور ایران میں جو انقلابات ہوئے ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں۔ یہ وقت ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی مدبرین اپنے قومی تحفظ کی مؤثر تدابیر عمل میں لائیں، ورنہ میرا خیال ہے کہ تیسری پشت میں مسلمان اس متحدہ قومیت ہی کے ایک جز ہو کر رہ جائینگے۔

(۳) فاضل مضمون نگار نے "نیشن" کے متعلق یورپ کا مستعمل نظریہ یوں بیان کیا ہے:۔

"کیونکہ "نیشن" کی جو موجود تعریف یورپ میں مستعمل ہے اس کے لیے "اسٹیٹ" کا ہونا لازمی ہے۔ یعنی وہ صرف اسی مجموعۂ افراد کو "نیشن" کا نام دینگے جو اپنی "اسٹیٹ" کے اندر آزاد و خود مختار زندگی بسر کر رہی ہو۔"

یہ غلط فہمی "نیشن" اور "اسٹیٹ" کے فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے۔ ایسی غلطیاں اکثر ان مصنفین سے ہوئی ہیں جو علم السیاست پر کافی عبور نہیں رکھتے۔ "نیشن" اور "اسٹیٹ" کے مفہوم کو خلط ملط کر دیا گیا ہے اور ایک کو دوسرے کا مترادف سمجھا گیا ہے۔ میں چند مثالیں اس غلط فہمی کو دور کرنے کیلیے پیش کرتا ہوں۔ سکاٹش (باشندگان سکاٹ لینڈ) اور ویلش (باشندگان ویلز) "نیشن" ہیں لیکن "اسٹیٹ" نہیں ہیں۔ اسی طرح سے فینی (باشندگان فن لینڈ) قوم ہیں لیکن اسٹیٹ نہیں۔ آسٹریا ہنگری اسٹیٹ تھی مگر نیشن نہیں تھی۔ یہ واضح ہو گیا ہو گا کہ یورپ میں "نیشن" کی مستعمل تعریف کی رو سے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ اپنی "اسٹیٹ" کے اندر خود مختار زندگی بسر کرے۔

ہمارے موضوع سے باہر ہے ورنہ ہم تفصیلاً "اسٹیٹ" کے تخیل کے ارتقائی مدارج بیان کرتے۔ لیکن اس جگہ نہایت اختصار کے ساتھ ہم "اسٹیٹ" کی توضیح کر دینا مناسب سمجھتے ہیں۔ جب سے سماج کا ظہور ہوا اسی وقت سے "اسٹیٹ" کا تخیل بھی پیدا ہوا۔ افلاطون اور ارسطو نے اس نظریہ کو پیش کیا۔ سولہویں صدی عیسوی سے یورپ کے مختلف الخیال فلاسفہ اسکی حسب ضرورت تشریح کرتے رہے۔ "اسٹیٹ" کا جدید نظریہ ھیگل کے فلسفیانہ نظریہ "اسٹیٹ" کی توضیح سمجھی جاتی ہے۔ "اسٹیٹ" (سلطنت) ایک سیاسی ہستی کا نام ہے۔ یہ اصطلاح انسانوں کی اس جماعت کیلیے استعمال کی جاتی ہے جو کسی واحد نظام حکومت کے ماتحت ہو اور اُس جماعت کی حیثیت مختار یا ایجنٹ کی ہوتی ہے جو آئین کے مطابق حکومت کرتی ہے۔ یہ آئین خواہ لکھا ہوا (Written.) ہو، جیسا کہ ممالک متحدہ امریکہ کا ہے یا بے لکھا (Unwritten.) ہو، جیسا کہ برطانیہ کا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ "اسٹیٹ" اور "نیشن" ایک ہی ہوں۔ "نیشن" کے اجزائے ترکیبی تمدن، جذبات، نسل اور زبان

وغیرہ ہو سکتے ہیں۔ اسٹیٹ کے اجزائے ترکیبی کو ان سے کوئی تعلق نہیں۔

(۴) ایک اور نظریہ جو فاضل مقالہ نگار نے پیش کیا ہے وہ یہ ہے:۔

"کوئی "نیشن" کسی دوسری نیشن پر حکمراں نہیں ہو سکتی۔ یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ محکوم قوم پر لفظ "نیشن" کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ جیسا کہ اوپر کسی جگہ بیان ہو چکا ہے "نیشن صرف اسی مجموعہ افراد کو کہا جاتا ہے جو اپنی حدود کے اندر آزاد و خود مختار زندگی بسر کر رہے ہوں اور "اسٹیٹ" کے مظہر ہوں"۔

جیسا کہ اوپر ثابت کیا جا چکا ہے "نیشن" کیلیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ "اسٹیٹ" کی بھی مظہر ہو۔ اگر اس اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ محکوم قوم پر لفظ "نیشن کا اطلاق نہیں ہوتا تو پھر جناب عزیز ہندی مسلمانان ہند کو "نیشن" کس اصول کے ماتحت تسلیم کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی تو محکوم ہیں؟

فاضل مضمون نگار نے ایک بہت وسیع قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے کہ "کوئی نیشن کسی دوسری نیشن پر حکمراں نہیں ہو سکتی" اور ساتھ ہی یہ بھی اضافہ فرما دیا کہ "یہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے"۔ کیا میں فاضل مضمون نگار سے محض علمی معلومات کے اضافہ کی خاطر دریافت کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ یہ اصول کس جگہ طے ہوا اور کون کونسی اقوام نے اسکو تسلیم کر لیا ہے؟ یا یہ محض سیاسی مفکرین کی خوش خیالیاں ہی ہیں؟ جہانتک یورپ کی تاریخ کا تعلق ہے اور جس کسی نے بھی یورپ کی سیاسی اور آئینی تاریخ کا ذرا گہری نظر سے مطالعہ کیا ہے وہ بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہے کہ یورپ کے سیاسی مدبرین نے کبھی اس نظریہ کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اسکا مضحکہ اڑایا اور اسکی تذلیل کی۔ جنگِ عظیم کے بعد پریزیڈنٹ ولسن نے

جب اقوام عالم کے قصرِ آزادی کا بنیادی پتھر نصب کرنے کے لیئے یورپ کی سرزمین پر قدم رکھا تو علم سیاست سے دلچسپی رکھنے والے خوب جانتے ہیں کہ برطانوی تدبر کے ہتھوڑے نے کس طرح اس قصرِ آزادی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر اسکی خاکِ پریشان کو ورسیلز کی فضا میں اُڑا دیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جناب عزیز نے ایک بہت ہی اہم اور دلچسپ بحث چھیڑ دی ہے جسکی تفصیلات میں جانے کے معنی یہ ہیں کہ اٹھارہویں صدی سے اسوقت تک کی یورپ کی سیاسی تاریخ کی چھان بین کی جائے۔ لیکن اس مختصر سے مضمون میں اسکی گنجائش کہاں! دیکھنا یہ ہے کہ یورپ نے آزاد نیشن کا جو تخیل پیش کیا ہے وہ کیا ہے؟ آیا یہ ایک نیشن دوسری نیشن کی آزادی کو برباد نہیں کریگی یا یہ کہ "میری نیشن"، "میرا ملک" آزاد ہو خواہ دوسروں کی آزادی یا دوسروں کا ملک برباد ہی کیوں نہ ہو جائے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ ایک قسم کے تاریخی واقعات سے دو مختلف نتائج نکال لیے جائیں۔ لیکن میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہ ہے کہ یورپ کی یہی تلقین رہی کہ "میری نیشن" اور "میرا ملک" ہی وہ فلسفہ ہے جو یورپ کے سیاسی مفکرین نے پیش کیا ہے۔ متقدمین فلاسفہ نے یہ تلقین کی کہ "میری قوم" سب سے افضل اور آزاد ہے، اور یہی سب سے زیادہ خداوند تعالیٰ کی رحمتوں کی حقدار ہے۔ متاخرین نے "نیشن" کے تخیل کو اتنا بڑھایا کہ خدا کو بھی پس پشت ڈال دیا اور صرف نیشن ہی نیشن باقی رہ گئی۔ اسکی مثال میں ہم مختصر طور پر مختلف ممالک کے مصنفین کے نظریے پیش کرتے ہیں۔

ملٹن (Milton.) کہتا ہے "خدا نے اپنی انگریز قوم کو سب سے پہلے اپنی ہستی سے روشناس کرایا"

نارتھ کلف (Northcliff.) کہتا ہے "حکومت کرنا برطانیہ کا حق ہے"۔

امریکن کہتے ہیں "امریکہ خدا کا اپنا ملک ہے"۔

میزنی (Mazzini) کہتا ہے "اٹلی ہی مذہب ہے"۔

گیسٹن ری ایو (Gaston Riou) کہتا ہے "غیر فانی فرانس، انسانی حقوق کا علم بردار ہے"۔

جرمنی سے آواز آتی ہے "ہم ہیں مقدس قوم۔ ہماری قوم دنیا کی تمام قومیتوں کی جڑ بنیاد ہے"۔

روس پکارنے لگا "قومیت ہی خدا ہے"۔

غرضکہ سرزمین یورپ کی ہر قوم نے اپنی آزادی کا نقارہ بجایا مگر دوسروں کی آزادی کو آزادی بالکل نہ سمجھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ یورپ کی ایک آزاد قوم دوسری قوم کی آزادی کو بے دریغ برباد کر دیتی ہے اور اسکو احساس بھی نہیں ہوتا کہ کسی قوم کی آزادی اس نے برباد کر ڈالی ہے۔

اب ہم چند تاریخی شواہد سے ثابت کرینگے کہ یہ اصول کہ "کوئی نیشن کسی دوسری نیشن پر حکمران نہیں ہو سکتی" کم از کم عملاً کبھی تسلیم نہیں کیا گیا۔

۱۷۸۹ء سے لیکر ۱۸۱۵ء تک یورپ کے سیاسی تخیل میں بہت تغیر رونما ہو چکا تھا۔ اس دور میں دو اصول بڑی شد و مد کے ساتھ پیش کیے گئے۔ پہلا یہ کہ حکومت رعایا کی مرضی کے موافق چلائی جائے۔ دوسرا یہ کہ انسانی حقوق کی تشریح اور مطالبہ کیا جائے۔ ان دونوں اصولوں کا اعلان امریکہ نے ۱۷۷۶ء میں اور فرانس نے ۱۷۸۹ء میں کیا۔ حقوق انسانی کا سوال "نیشن" کے مسئلہ سے ملحق ہے۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ عملاً اسکے بعد کیا ہوا۔

۱۸۱۵ء کی ویئینا کی کانگرس میں "نیشن" کے اصولوں کو انگلستان نے کچل کر رکھ دیا۔ آئرش قوم کی آزادی کے مسئلہ کو کرامویل نے اسکا سر کچل کر حل کیا۔ اور ۱۸۴۸ء میں آئرلینڈ کی آزادی کو بے دریغانہ تباہ کیا گیا۔

۱۸۵۶ء کی کانگرس میں "نیشن" کا مسئلہ فرانس کی طرف سے پیش ہوا مگر پھر انگلستان نے اسکو رد کر دیا۔

۱۸۷۹ء کی برلن کانگرس میں رومانیا، سربیا، مانٹی نیگرو کو ظاہری طور پر ترکی سے آزاد کرایا گیا مگر اسی کانگرس میں بوسینا اور ہرزیگووینا کو آسٹریا کے ماتحت کیا گیا اور قبرص کو برطانیہ کے ماتحت۔

۱۸۸۲ء میں مصر کی آزادی کو برطانیہ نے برباد کیا۔

انگلستان نے "نیشن" کے تخیل کا جس حربہ سے مقابلہ کیا وہ توازن قوت (Balance of Power) کا مسئلہ تھا۔

۱۹۱۹ء کی جنگ عظیم اور ورسیلز کے صلح نامہ نے فیصلہ کر دیا کہ نیشن کے تخیل کو شکست ہوئی۔

۱۸۱۵ء سے ۱۹۱۴ء تک کے تمام واقعات دیکھ لیجئے۔ ان میں سیاسی مفکرین کے تخیل "نیشن" اور سیاسی مدبرین کے تخیل "شہنشاہیت" میں جنگ نظر آتی ہے، جسکا آخری نتیجہ یہ ہوا کہ نیشن کے تخیل کو شکست ہوئی۔ آپ دیکھینگے کہ اسی دور میں ایک طرف تو یونان، بلقان وغیرہ کو ترکی سے آزادی دلوائی جاتی ہے مگر دوسری طرف فرانس جو انسانی حقوق کا علمبردار بنتا ہے، الجزائر اور ٹیونس کی آزادی کو تباہ کر دیتا ہے۔ اٹلی خود اپنی آزادی کا علم بلند کرتا ہے اور طرابلس اور حبشہ کی آزادی کو ہڑپ کر جاتا ہے۔ برطانیہ آزادی کا مدعی

بن کر اٹھتا ہے اور ہندوستان، مصر، فلسطین اور دیگر مشرقی ممالک کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑتا نظر آتا ہے۔ جاپان کوریا اور چین کی آزادی کو چھین رہا ہے۔ مگر یہ سب کچھ "نیشن" اور "آزاد نیشن" کے اصولوں کے تحت میں ہو رہا ہے۔ اگر واقعات کو واقعات کی بنا پر دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ اس دور میں یہ اصول کبھی تسلیم نہیں ہوا کہ "کوئی نیشن کسی دوسری نیشن پر حکمران نہیں ہو سکتی"، بلکہ مطلق العنان حکومتوں کو "قومیت" کا جامہ پہنا کر سامراجی کا بول بالا کیا گیا ہے۔ اور بالکل یہی چیز ہے جسکا اعادہ ہندوستان کی قومی کانگرس کمزور مسلمانوں پر "قومیت" کا کمبل ڈال کر کرنا چاہتی ہے۔

ہم نے خالص علمی حیثیت سے اس مضمون پر تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس مضمون میں اسقدر گنجائش نہیں ہے کہ ہم "نیشن" کے نہایت ہی پیچیدہ مسئلہ کو زیادہ وضاحت سے بیان کریں کیونکہ ابھی بہت سے ایسے پہلو ہیں جنکو ہمیں نظر انداز کرنا پڑا ہے۔

جواب

از جناب عزیز ہندی

میں جناب نذیر احمد صاحب قریشی کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے میرے مضمون "مسلمان قوم ہیں یا فرقہ" پر فاضلانہ تنقید فرما کر مجھے ایک بار پھر اس امر کا موقع دیا ہے کہ میں اس موضوع پر اپنے ناچیز خیالات کو ترجمان القرآن کے ذریعہ سے پیش کروں۔ لیکن قبل اس کے کہ میں اصل موضوع پر قلم اٹھاؤں میں یہ بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھے مدیر صاحب ترجمان القرآن نے صرف چند صفحوں میں اپنا مطلب بیان کرنے کی اجازت دی ہے حالانکہ مضمون کی اہمیت کا تقاضا

یہ ہے کہ اس پر ایک مبسوط کتاب لکھی جائے۔ پس میں صرف اساسی بیانات پر اکتفا کرونگا۔ اسے پیشِ نظر رکھا جائے۔

دراصل مذکورۂ بالا مضمون میرے ایک پمفلٹ موسومہ "ہندوستان کے مسلمان کا نصب العین کیا ہے" کا ایک اقتباس ہے، اور چونکہ میری فکر کا پس منظر جناب نذیر احمد صاحب قریشی کی نگاہوں سے اوجھل رہا ہے اس لیے انہوں نے میرے بیان کردہ بعض نظریات کی غلط طور پر تعبیر کی ہے۔ پھر میں یہ حقیقت بھی اسی جگہ بیان کر دینا چاہتا ہوں کہ جن کو وہ "میرے نظریے" کہتے ہیں، میرے نزدیک ان کی مستقل حیثیت ثابت نہیں۔ البتہ جس نظریہ کو میں پیش کر رہا ہوں یہ اس کی شاخیں (Offshoots) کہی جاسکتی ہیں۔

دوسری بات جسے میں شروع ہی میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے فاضل دوست نے تنقید کیلیے جو پہلو اختیار کیا ہے وہ سوائے چند ایک باتوں کے اس نقطۂ نظر سے بالکل مختلف ہے جسے میں پیش کر رہا ہوں۔ تاہم میں سمجھتا ہوں کہ ان کے اعتراضات پر سلسلہ دار روشنی ڈالنا یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

(۱) وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک قاعدۂ کلیہ بیان کر رہا ہوں کہ

"اپنا الگ مسلک اور الگ طریقِ زندگی رکھنا ہی کسی جماعت کا ایک قوم ہونا ہے۔"

دراصل میں جس نظریہ کو دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں وہ یہ ہے کہ انسانوں کا کوئی مجموعۂ افراد اس وقت تک اپنے آپ کو قوم کے وجود میں نہیں ڈھال سکتا جس وقت تک کہ ان کی ذہنیت یا زاویۂ نگاہ کے اندر ایک قریبی مماثلت و مشابہت پیدا نہ ہو جائے خواہ ایسی مماثلت یا مشابہت نسلی بنا پر میسر آئی ہو، یا زبان، مقام یا ہم عقیدگی کی بنا پر پیدا ہوئی ہو۔ پس میں قوم کے وجود کیلیے "ذہنیت" کو مدارِ اولیں قرار دیتا ہوں۔ جن دو مجموعہ افراد کی ذہنیتیں مختلف ہیں ان کا مسلک

اور طریقِ زندگی کے لحاظ سے مختلف ہونا ایک طبیعی امر ہوگا۔ اب، ان کا مسلک و طریقِ زندگی کے اعتبار سے یہی اختلاف، ان کو امتیاز کے ساتھ آپس میں جدا کر رہا ہوگا اور وہ دو الگ الگ قومیں متصور ہونگی۔

اگر ذہنیت کے اس اختلاف کو ہم عمومیت کیساتھ آج یورپ پر منطبق کریں تو ہمیں یہ تسلیم کرنیکے بغیر کوئی چارہ کار نہ رہیگا کہ یورپ تیزی کیساتھ دو بڑے محاذوں میں تقسیم ہو رہا ہے۔ ایک محاذ اشتراکیت کا ہے اور دوسرا سرمایہ داری کا۔ اب فرض کر لیجیے کہ جو مؤثرات (Factors) ان دو محاذوں کے وجود میں لانے کا باعث ہوئے ہیں، وہ اگر کسی تیسرے قوی تر مؤثر کو پیدا نہ کرلیں تو یہی مؤثرات ان مختلف اور متعدد قوموں کو جو سرمایہ دار اور اشتراکی دنیاؤں میں بس رہی ہیں، اندر ہی اندر بدلتے چلے جائینگے اور ان کی قومیتوں کی علحدہ حدودِ امتیاز کو مٹانا شروع کر دینگے، یعنی ایک طرف سرمایہ دار اقوام، اشتراکیت کے برخلاف، اپنی حفاظت و صیانت کیلیے زیادہ سے زیادہ متفق و متحد ہونا شروع ہونگی، اور دوسری طرف یہی ردِ عمل اشتراکیت کے داخلی قواء عناصر پر بھی واقع ہوگا۔ اس کے اجراء کی پہلی صورتِ حال یہ ہوگی کہ دونوں محاذوں پر ایک قسم کا وفاقی نظام پیدا ہوگا، جو اگرچہ ممالک کی موجودہ حدود و اقوام کو بحالہ قائم رہنے دیگا، لیکن انکی ملکی سیاست و سیادت کے موجودہ دائرے کو توڑ کر اسے وسیع تر کر دیگا۔ اور اگر یہاں بھی ان اقوام کو پناہ نہ مل سکی تو پھر وہ اسی وفاقی نظام کو ایک مرکزی نظام کی صورت میں تبدیل کر دینے پر مجبور ہو جائینگی۔ اور جب یہ چیز وقوع میں آجائیگی تو قوموں کا موجودہ امتیاز ناپید ہو جائیگا، اور ان مختلف و متعدد اقوام کے امتزاج سے جو قوم پیدا ہوگی وہ ایک نئی قوم ہوگی جسکا زاویۂ نگاہ، مسلک یا طریقِ زندگی، موجودہ یورپین اقوام سے یقیناً مختلف و متغائر ہوگا۔

نظامِ فطرت اپنے قانونِ امتداد و انقباض

سے کے ذریعہ سے اقوام کے ماحولی تغیرات و انقلابات پر اثر انداز ہوتا ہے، اور انہیں منقلب و تحلیل کرکے نئے نئے ناموں سے پیدا اور متعارف کرتا رہتا ہے۔ میرے دوست نے "قوم کے سیاسی یا خارجی وجود کے تجزیہ" کے ماتحت مجھے یہ بتلانے کی ناحق کاوش کی ہے کہ قوم چار قسم کی ہوتی ہے۔ اول بسیط (Simple)، دوم مخلوط (Complex) سوم مرکب (Compound) چہارم ممزوج (Hybrid)

پہلے تو میں یہی نہ سمجھ سکا کہ "قوم کے سیاسی یا خارجی وجود" سے ان کا مطلب کیا ہے۔ "قوم" کی حیثیتِ سیاسی کا وجود میں آنا "قوم" کے بننے سے پہلے کس طرح ممکن ہے؟ اور اگر یہ کہا جائے کہ قوم مجرد بننے کے اپنا سیاسی یا خارجی وجود قائم کرلیتی ہے تو پھر یہ تسلیم کرلینا پڑیگا کہ قوم کا "خارجی یا سیاسی وجود" اس کی تشکیل کی فطرت میں مضمر (Inherent) ہے، اس لیے یہ کوئی الگ شے نہیں جو خارج از "وجودِ قوم" کسی ہیئت (Phase) پر دلالت کررہا ہو۔ لہٰذا اس طرح قوم کی ہر تقسیم، خواہ وہ بسیط ہو یا مخلوط یا مرکب یا ممزوج بہر حال اس کا مدار اس ذہنیت پر منحصر اور موقوف ہوگا جس کی مماثلت اور مشابہت کی بنا پر اس کے جملہ عناصر ترکیب پائے ہیں۔ اب خواہ اسے بسیط یا مخلوط کہہ لو اور خواہ اسے مرکب یا ممزوج کا نام دے لو۔

حقیقت ایک ہے ہر شے کی نوری ہو کہ خاکی ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرے کا دل چیریں

آگے چل کر میرے دوست نے "قوم کی نفسیاتی کیفیت کا تجزیہ" کرتے ہوئے قانونِ اشتراکِ مسلسل، قانونِ خطراتِ مشترکہ اور قانونِ اشتراکِ ایثاری کا حوالہ دے کر اس امر کو خود بخود تسلیم کرلیا ہے کہ

"اگر سیاسی اجزائے ترکیبی قوم میں موجود ہوں مگر نفسیاتی کیفیات پیدا نہ ہوں

تو یہ ایک غیر کیمیاوی مرکب ہوگا جو کسی نہ کسی وقت الگ الگ اجزاء میں تقسیم ہو کر رہ جائیگا"
یعنی بالفاظ دیگر اگر کسی مجموعۂ افراد میں نفسیاتی کیفیات پیدا نہ ہوں تو نسل، زبان اور جغرافیائی حدود یہ سب مؤثرات (Factors) باہم مل کر بھی انہیں ایک قوم کی شکل و صورت میں متحد نہیں کر سکتے۔ اور اگر وہ کسی طرح بعض خاص حالات کے دباؤ کے ماتحت متحد ہو بھی گئے ہوں تو ایک وقت ان پر ایسا ضرور آئیگا کہ وہ باہم متفرق و پریشان ہو کر رہ جائینگے۔

یہاں میرے دوست خود میری ہی طرح "ذہنیت" کو قوم کے وجود کی تشکیل و ترتیب کا مدار و اساس قرار دے رہے ہیں، اور چونکہ معلومات علم کی فراوانی کیساتھ ان میں توافق کی قوت (Power Assimilating.) کم ہے اس لیے وہ اپنے تصور میں خود الجھ کر رہ گئے ہیں۔ وہ جسے قانون اشتراک مسلسل، قانون خطرات مشترکہ اور قانون اشتراک ایثاری وغیرہ کے مختلف ناموں سے گنوا رہے ہیں یہی تو دراصل "ذہنیت" کے وہ اجزاء متفرقہ ہیں جن سے اسکا قوام تیار ہوتا ہے۔[1]

[1] ترجمان القرآن۔ اشتراک مسلسل، خطرات مشترکہ اور اشتراک ایثاری دراصل ذہنیت کے اجزاء نہیں ہیں، بلکہ افراد کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے والے خارجی محرکات ہیں۔ اگر افراد میں تماثل ذہنی، یعنی اساس قومیت موجود ہے، تو یہ اسباب ان میں شدید اتصال پیدا کر کے ایک طاقتور قومیت پیدا کر دینگے، اور اگر تماثل ذہنی موجود نہیں ہے تو یہ اسباب عارضی طور پر ان میں قربت اور تعاون تو پیدا کر سکتے ہیں، مگر جوڑ کر ایک قوم نہیں بنا سکتے۔ مشترک خطرات کے رفع ہوتے ہی ایک ایک جزء پھر الگ ہو جائیگا۔ دراصل ذہنیت کے اجزاء ترکیبی وہ امور ہیں جنکے مجموعہ کو ہم تہذیب کہتے ہیں، یعنی طریق فکر، نظریۂ حیات، معیار امتیاز و انتخاب یا معیار قدر (Standard of Values) اور وہ اصول زندگی جن کا ظہور مختلف تمدنی طریقوں میں ہوتا ہے۔ اسی چیز کا تماثل دراصل قومیت کا ہیولیٰ تیار کرتا ہے، اور اشتراک مسلسل وغیرہ اسباب محض اس ہیولیٰ کی صورت گری میں مددگار ہوتے ہیں۔ مختلف تہذیبیں رکھنے والی قوموں کو ملا کر ایک بسیط یا مرکب یا کسی اور قسم کی قوم بنا دینا ان

اب میں اپنے دوست سے کہہ سکتا ہوں کہ صرف ذہنیت ہی کی مماثلت و مشابہت سے قوموں کا وجود معرض ظہور میں آتا ہے، نسل، زبان اور جغرافیائی حدود اس کی ازدیادی و امدادی قوتیں (Auxiliary Forces) ہیں اور بس۔

اب جس طرح قوم کی تشکیل کا مدار، اسکے افراد کی ذہنیت کی یکسانیت پر ہے اسیطرح خود ذہنیت کا مدار اولین وہ اعتقادات یا نظریات ہیں جو کسی مجموعۂ افراد میں عمومی طور پر پائے جاتے ہیں مگر ہم یہاں یہ بحث کرنے نہیں بیٹھینگے کہ یہ اعتقادات و نظریات، کسی مجموعۂ افراد میں کس طرح پیدا ہوئے اور اس میں نسل، زبان اور جغرافیائی حدود، ہر ایک کا کیا حصہ ہے۔

میرا یہ دعوے ہے کہ یورپ کے فلاسفہ اور سیاسی مفکرین صحت و وضاحت کیساتھ "قوم" کی اصل ترکیبی علت کو نہیں پا سکے، اور اس میں ان کا چنداں قصور بھی نہیں۔ یہ اس لیے کہ ان کا وہ فکری پس منظر جسے یورپ کی تاریخی روایات اور مخصوص ماحول نے ان کیلیے پیدا کر رکھا تھا، اس قدر الجھا ہوا تھا کہ وہ اصل حقیقت کو پا ہی نہ سکتے تھے۔ پس قوموں کے وجود و تشکیل کے متعلق میں جس نظریہ کو پیش کر رہا ہوں اسکا سراغ یورپین مصنفین کے افکار میں تلاش کرنا فضول ہے۔ میرے نظریہ کی

بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۹۰۔ اسباب کے بس کا کام نہیں ہے۔ یہ نتیجہ صرف اس صورت میں رونما ہوتا ہے جبکہ یا تو ان قوموں کی تہذیبوں میں کوئی اہم بنیادی اختلاف نہ ہو، یا ان کی تہذیبیں مستحکم ہو کر انکو مضبوط قومی صورتوں سے متصور نہ کر چکی ہوں، یا ان میں سے ایک قوم کی تہذیب اتنی طاقت ور ہو کہ مساویانہ اشتراک و تعاون کے دوران میں خود بخود وہ دوسری اقوام کی تہذیبوں کو مٹا دے اور ان کے دل و دماغ پر مستولی ہو جائے، یا پھر تعاون و اشتراک ایسا غیر مساویانہ ہو کہ ایک قوم تمام سیاسی و معاشی طاقتوں پر قابض ہو جائے اور باقی دوسری قوموں کو مغلوب کر کے زبردستی ان کی تہذیب کا استیصال کر دے۔ بہر حال خواہ کوئی صورت ہو، تبدیلِ ذہنیت، یا تغیرِ تہذیب کے بغیر ایک قوم کا دوسری قوم میں متبدل ہو جانا قطعاً ناممکن ہے۔

اساس "ذہنیت" پر ہے۔ افراد "ذہنیت" کی یکسانیت سے قوم بنتے ہیں اور اسی کے اختلاف سے منتشر و پراگندہ ہو جاتے ہیں۔ خود "ذہنیت" جس بنیاد پر قائم ہے وہ اشیاء و حقائق کے متعلق افراد کے اعتقادات و نظریات ہیں۔ اب جس نوع کی ذہنیت ہوگی اسی نوع کا مسلک و طریقِ زندگی ہوگا۔ پس میرا یہ کہنا کہ مسلک و طریقِ زندگی ہی کے اعتبار سے قومیں آپس میں الگ شناخت ہو سکتی ہیں، مہمل یا مبہم نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری کی ایسی تاویل ہے جسے یورپ کے مادیئین آج اس وضاحت کیساتھ پیش نہیں کر سکے۔

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں

(۲) میرے دوست اپنے دوسرے اعتراض کے شروع میں میرا یہ فقرہ نقل کرتے ہیں:-

"جناب عزیز ایک اور نظریہ پیش کرتے ہیں کہ اقوام کا دفعتہً[۱] چولا بدل ڈالنا تاریخ تجربہ انسانی اور فطرت کے آئین کے بالکل برخلاف ہے اس لیے متعدد اقوام ہند کا محض مقامی[۲] تعلق کی بنا پر ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا نہایت ہی غیر اغلب اور ناممکن ہے۔"

پھر اس نظریے کے پہلے حصہ کو صحیح و درست قرار دے کر اس کے دوسرے حصہ پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ:-

"لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ متعدد اقوام ہند کا محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا غیر اغلب اور ناممکن کیوں ہے"؟

پھر وہ اس کو وقوع میں لانے والی چار قوتوں کا شمار کرتے ہیں: وطنی عصبیت[۱]۔ جارحانہ[۲] شدت۔ نفسیاتی[۳] ترغیب یا پروپیگنڈا[۴]۔ کمزور کا طاقتور کی تقلید کرنا۔ اور اس کے بعد وہ امریکہ

اور روس کی قومیتوں کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب وہاں یہ تبدیل ہیئت ممکن تھی تو یہاں ہندوستان میں یہ کیوں ممکن نہیں ؟

میں کہونگا کہ میرے دوست نے میرے مطلب کو سمجھا ہی نہیں حالانکہ وہ واضح ترین الفاظ میں تحریر ہے، اور پھر لطف یہ ہے کہ وہ اعتراضاً جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کی تہ تک خود ان کی اپنی نظر بھی نہیں پہنچی !

میں نے زیر نظر فقرے میں جو کچھ بیان کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہندوستان کی متعدد اقوام کا محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا نہایت ہی غیر اغلب اور ناممکن ہے۔

میرے دوست ہندوستان میں متعدد اقوام کے وجود کو تسلیم کر رہے ہیں، لیکن اسی کے ساتھ وہ محض مقامی تعلق کی بنا پر ان کا ایک واحد قومیت میں ڈھل جانا بالکل اغلب اور ممکن سمجھ رہے ہیں۔ کیا میں انکی فکر و نظر کی درستی کیلیے یہ سوال کر سکتا ہوں کہ پھر کیوں محکومیت کے اس ڈیڑھ سو سالہ دور میں، اب تک ہندو مسلمان اور یہاں کی دیگر قومیں محض مقامی تعلق کی بنا پر ایک نہ ہو گئیں ؟ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ دور دور محکومیت تھا اور انگریزوں کے غلبہ و مزاحمت کی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا، تو پھر کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس سے پہلے تقریباً ایک ہزار سالہ دور جب کہ خود مسلمان یہاں پر حکومت کر رہے تھے ایسا کس بنا پر نہ ہو سکا ؟ کیا اکبر نے اپنی "الٰہی پالیسی" کے ماتحت اس کیلیے کچھ کم زور صرف کیا تھا ؟ پس اپنے ہی وطن کی ان دو مثالوں سے ظاہر ہے کہ محض وطنی تعلق اس کے لیے سریع الحرکت طاقت (؟) نہیں۔

ہاں جب آپ کہتے ہیں کہ پہلے وطنی عصبیت پیدا ہو اور پھر اس عصبیت کی بنا پر تشدد اور

مظالم کئے جائیں (جیسا کہ روس میں ہوا) اور اس کے ساتھ ہی پروپیگنڈا کے تمام حربے بھی کام میں لائے جائیں اور پھر ان سب کے علاوہ قانون تغیر (Law of Change) بھی اپنا عمل دخل کرے تو البتہ آپ کسی متحدہ قومیت کی شکل دیکھ سکتے ہیں۔ لیکن کیا یہ سب طاقتیں جنکو آپ نے اوپر گنوایا ہے نفسی تغیرات نہیں جنکے بغیر آپ خود تسلیم کر چکے ہیں کہ "قوم ایک غیر کیمیاوی مرکب ہے۔ جو کسی نہ کسی وقت الگ الگ اجزاء میں تقسیم ہو کر رہ جائیگا۔"

آپ دراصل یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر ان حربوں کی طاقت سے ہندوستان کی متعدد اقوام کی ذہنیت کو یورپ کے موجودہ نظریۂ وطنیت کے مطابق ڈھالنا شروع کر دیا جائے تو کسی وقت یہ ملک بھی امریکہ اور روس کے ممالک کی طرح متحدہ قومیت کا حامل ہو جائیگا۔ شاید ایسا ہی ہو لیکن کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان نفسی تغیرات کا تعلق براہِ راست قوموں کی ذہنیت سے ہے یا محض کسی جگہ کے "مقامی تعلق" سے جسکی بنا پر میں ناممکن و غیر اغلب کا لفظ استعمال کر رہا ہوں؟

آپ دیکھ سکتے ہیں کہ میں اپنے نظریے میں کتنا صاف اور آپ اپنے بیان میں کس قدر الجھے ہوئے ہیں۔ اب آپ پر اس حقیقت کو بھی کھول دینا چاہیے کہ میں ہندوستان میں کسی متحدہ قومیت کے وقوع کو ناممکن اور غیر اغلب نہیں سمجھتا بلکہ میں نے جس چیز کو ناممکن اور غیر اغلب کہا ہے وہ یہاں کسی واحد قومیت کی پیدا دار ہے۔

گو اب گنجائش نہیں کہ میں اس اعتراض پر مزید تفصیل کے ساتھ کچھ لکھوں تاہم میں اپنے دوست کو یہاں بتلا دینا چاہتا ہوں کہ "متحدہ قومیت" اور "واحد قومیت" میں ایک بین فرق ہے۔ ہندو قوم یہاں متحدہ قومیت نہیں چاہتی جو الگ الگ قوموں کے اساس پر قائم ہو، بلکہ وہ یہاں واحد قومیت کے وجود کی تمنائی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ قوموں کے امتیازی

نشانات کو مٹا کر انہیں ایک نئی قوم کے قالب میں ڈھال دیا جائے۔

امریکہ یا سوئٹزرلینڈ کی مثالیں یہاں منطبق نہیں ہوسکتیں کیونکہ گو ان کی وفاقی اکائیوں (Federal Units) میں نسل وزبان کی مغایرت موجود ہے تاہم صدیوں سے ان کی فکر کا جو مادّی پس منظر بن چکا ہے اس میں یکسانیت کے سوا اور کچھ نہیں۔ پس وہاں بھی ذہنیت کی یکسانیت ہے جو ان کو آپس میں متحد کیے ہوئے ہے نہ کہ مقامی تعلق۔ کیا آپ نے دیکھا نہیں کہ نازی جرمنی نے آسٹریا میں اس "مقامی تعلق" کی کیا گت بنائی ہے اور پھر آپ کھلے دیدوں آج زیکوسلاویکیا میں جرمن اقلیت کو پر پرزے نکالتے ہوئے نہیں دیکھ رہے ہیں؟ اب وہ مقامی تعلق کہاں ہے جو جرمن اقلیت کو زیکوسلاویکیا سے وابستہ کیے رکھیگا؟ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ذہنیت کا ذرا سا باہمی تفاوت بھی، اقوام کی متحدہ صنعت کے لیے برداشت کے قابل نہیں۔

پھر امریکہ میں وہاں کے اصلی باشندوں کی حالتِ زار پر بھی ایک نظر ورڈالیجیے اور میری بات کی تصدیق کیجیے۔

(۳) آپ کا تیسرا اعتراض بھی سرتاپا غلط فہمی پر مبنی ہے۔ آپ میرے اس بیان کو کہ:

"نیشن کی جو موجودہ تعریف یورپ میں مستعمل ہے اس کے لیے "اسٹیٹ" کا ہونا لازمی ہے یعنی وہ صرف اسی مجموعۂ افراد کو نیشن کا نام دینگے جو اپنی "اسٹیٹ" کے اندر آزاد و خود مختار زندگی بسر کر رہی ہو۔"

اس بنا پر غلط قرار دے رہے ہیں کہ گویا میں نیشن کیلیے "اسٹیٹ" کا ہونا ہر حال میں لازمی قرار دے رہا ہوں۔ حالانکہ میں نے تو اس مذکورہ بالا اقتباس میں یورپ کی ان اقوام کی طرف اشارہ کیا ہے جنکے ہاتھ میں آج مظلوم اور پامال قوموں کی قسمت کی باگ ڈور ہے، اور میرا

دعوے یہ ہے کہ وہ محکوم اقوام کو "نیشن" کے لقب سے ملقب نہیں کرتے ۔ اسی لطیف فرق کو سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ اگر سکاٹ لینڈ کے باشندے اب تک اپنے آپ کو "نیشن" کے اسم ولقب سے پکار رہے ہیں تو وہ بلاشبہ ایک محکوم نیشن ہیں جو انگریزوں کی محکومیت میں آئے ہوئے ہیں، اور وہ دن دور نہیں جب کہ وہ آئرلینڈ کی طرح، اپنی گذشتہ روایات کو از سرِ نو تازہ کرکے اپنی آزادی کیلیے انگلینڈ سے برسرِ جنگ ہونگے ۔ لیکن اگر وہ ہمیشہ کیلیے اپنی موجودہ پوزیشن پر قانع ہو گئے ہیں اور اپنی گذشتہ روایاتِ جنگ آزادی کو ذہن سے بالکل خارج کر چکے ہیں تو یقیناً وہ اب نیشن نہیں رہے بلکہ نرے سکاچ یا ہائی لینڈرز رہ گئے ہیں جن کی نسل گو علحدہ ہو، زبان کا تلفظ گو انگریزوں کی نسبت سے کرخت اور مردانہ ہو، مگر پھر بھی وہ نیشن نہیں کہلائینگے[1] ۔ کیا آپ مجھے آئین انگلستان میں سے کوئی دفعہ ایسی دکھلا سکتے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہو کہ اہلِ سکاٹ لینڈ کو نیشن تسلیم کرتے ہوئے پارلیمنٹ میں جگہ دی گئی ہے ؟

پھر آپ کیا مجھے بتلا سکتے ہیں کہ جنگِ عظیم کے خاتمہ پر آسٹریا ہنگری کی سلطنت کو کیوں قائم نہ رہنے دیا گیا ؟ جرمنی کو کیوں ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیا گیا ؟ ترکی کو صفحۂ ہستی سے کیوں نہ مٹا دیا گیا ؟ اور دیگر چھوٹی بڑی کئی اسٹیٹس کو کیوں وجود میں لایا گیا ؟ انتدابی Mandatory) سسٹم کی جگہ فاتحین نے کیوں متعدد ممالک وحصص پر قبضۂ ملوکانہ یا الحاق کی پالیسی کو روا نہ رکھا ؟ اگر آپ ان تمام واقعات کا علم وبصیرت کے ساتھ مطالعہ کرینگے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ یورپین اقوام کا بیسوی صدی کے آغاز اور بالخصوص جنگ کے بعد یہی کچھ معمول رہا ہے جیسے

[1] ترجمان القرآن ۔ مدعا یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی قوم کو دبا لیتی ہے اور رکھا جانا چاہتی ہے تو وہ اسکو "قوم" کے نام سے موسوم نہیں کرتی، بلکہ اس میں سے یہ احساس دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہے وہ ایک "قوم" ہے ۔ دوسری طرف وہ قوم جو دب چکی ہو، اگر اپنے آپ کو ابھی تک قوم سمجھ رہی ہے، تو اسکے معنی یہ ہیں کہ اس میں ابھی تک زندگی موجود ہے اور وہ ابھر سکتی ہے، اور اگر اس نے خود ہی اپنے آپ کو قوم کہنا اور سمجھنا چھوڑ دیا ہے تو یہ اس بات پر دلیل ہے کہ وہ غالب قوم کیلیے قابلِ ہضم غذا بن چکی ہے، اب اسکی زندگی کا اعادہ ممکن نہیں ۔

میں نے اقتباس مذکورہ میں پیش کیا ہے ۔ انگریزی سیاست نے یہودیوں تک کو جو اس کرۂ ارض پر تسبیح کے منتشر دانوں کی طرح سے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے نیشن کے طور پر تسلیم کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھا کہ ان کیلیے ایک "نیشنل ہوم" موجود کیا جائے، پھر اگر میں نے یہ کہا ہے کہ "اسٹیٹ" نیشن کی مظہر ہوتی ہے تو اس میں تعجب کی کونسی بات ہے ؟ کیا روح جسم کے بغیر قائم رہ سکتی ہے اور کیا آپ یہودیوں کو جب کہ ان کا کوئی گھر نہ ہو نیشن تسلیم کرینگے ؟ اگر آپ ایسا کرینگے تو پھر بتلائیے کہ اس کے عملی اظہار کی کیا صورت ہوگی ؟

آپ کہتے ہیں کہ میں نے نیشن اور اسٹیٹ کو باہم مترادف سمجھ لیا ہے ۔ کیا آپ روح اور جسم کو باہم مترادف سمجھتے ہیں ؟ اگر نہیں تو یقیناً میں بھی نیشن اور اسٹیٹ کو دو مختلف حقیقتیں سمجھ رہا ہوں لیکن یہ ایسی ہیں کہ ایک کے بغیر دوسری قائم نہیں رہ سکتی ۔

آپ خود تسلیم کرتے ہیں کہ "اسٹیٹ" کا جدید نظریہ ہیگل کے فلسفیانہ نظریۂ اسٹیٹ کی ایک توضیح سمجھی جاتی ہے جسکے ماتحت اسٹیٹ ایک سیاسی ہستی کا نام ہے ۔ کیا میں اپنے عزیز دوست سے پوچھ سکتا ہوں کہ "سیاسی ہستی" کس وجود کی نمائندہ ہے ؟ آپ کو اس سوال کا جو جواب حاصل ہو میں اسی کو نیشن کہتا ہوں ۔

پس اب میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم "نیشن" اسی کو کہینگے جو اپنی ہستی کی اسٹیٹ کے ذریعہ سے مظہر ہو ۔ یہ نیشن بسیط یا مخلوط بھی ہوسکتی ہے اور مرکب یا ممزوج بھی ۔ مگر خواہ یہ کسی درجہ و قسم سے تعلق رکھے اس کی اساس ذہنیت کی یکسانیت پر ہوگی، مقامی تعلق پر نہیں ۔

مگر یورپ کے فلاسفہ اور سیاسی مفکرین اس وضاحت کیساتھ اس حقیقت تک نہیں پہونچے تو اس کیلیے آپ مجھے مورد الزام نہ ٹھیرائیں اگر ایک بات جسے یورپ والوں نے بصراحت نہ سمجھا ہو اور وہ آپکے ایک بھائی کی سمجھ میں آگئی ہو تو کیا آپ کیلیے یہ کوئی ذلت کی بات ہوگی ؟

آپ اخیر میں کہتے ہیں کہ "نیشن کے اجزائے ترکیبی تمدن، جذبات، نسل اور زبان وغیرہ ہوسکتے ہیں۔ اسٹیٹ کے اجزائے ترکیبی کو ان سے کوئی تعلق نہیں"

کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اسٹیٹ کے اجزائے ترکیبی آپ کے نزدیک کیا ہیں؟ کیا یہ اجزاء ترکیبی نیشن کی بجائے کسی اسٹیٹ کے جنگل، پہاڑ، نہر اور دریا تو نہیں!

(۴)

(۴) میرے دوست کا چوتھا اعتراض میرے مضمون کے مندرجۂ ذیل اقتباس کے متعلق ہے:-

"کوئی نیشن کسی دوسری نیشن پر حکمراں نہیں ہوسکتی" یہ اصول تسلیم کرلیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ محکوم اقوام پر لفظ "نیشن" کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا، بلکہ جیسا کہ اوپر کسی جگہ بیان ہوچکا ہے "نیشن صرف اسی مجموعۂ افراد کو کہا جاتا ہے جو اپنی حدود کے اندر آزاد و خود مختار زندگی بسر کر رہے ہوں اور اسٹیٹ کے مظہر ہوں۔"

اس اقتباس کو نقل کرنیکے بعد وہ کہتے ہیں کہ "اگر اس اصول کو تسلیم کرلیا جائے کہ محکوم قوم پر لفظ "نیشن" کا اطلاق نہیں ہوتا تو پھر جناب عزیز ہندی مسلمانان ہند کو "نیشن" کس اصول کے ماتحت تسلیم کرتے ہیں کیونکہ وہ بھی تو محکوم ہیں؟"

میں اپنے دوست سے استدعا کرونگا کہ وہ میرے مضمون کو ایک دفعہ از سر نو پڑھ لیں میں نے اسی مضمون میں یہ وضاحت کیساتھ بیان کردیا ہے کہ انگریز جو کہ ایک حکمران نیشن ہیں ہم کو "نیشن" کے اسم و لقب سے نہیں پکارتے بلکہ ہمیں کیمونٹیز کہتے ہیں، لہذا اس مذکورہ بالا اصول کے ماتحت انگریزوں کے زاویۂ نگاہ سے تو یقیناً ہم کیمونٹیز ہی ہیں، لیکن ہمارا زاویۂ نگاہ اپنے متعلق یہ نہیں ہے، ہمیں اگر (ان کے زاویۂ نگاہ کو غلط قرار دیکر) کیمونٹی سے نیشن بننا ہے تو ہم اپنے لیے نیشن ہونے کا ہی دعویٰ کرینگے۔ کیونکہ اسی بنا پر ہم اپنی آزادی کا مطالبہ پیش

کر سکتے ہیں۔

میں مسلمانانِ ہند کو "نیشن" تسلیم نہیں کرتا ، میں تو ان کے نیشن ہونے کے دعوے کو تسلیم کرتا ہوں ، کیونکہ میں اسی بنا پر ان کی آزادی کا مطالبہ کر سکتا ہوں ۔ اور یہ وہی اصول ہے جسے میرا دوست "میری نیشن" "میرا ملک" کے مغربی نعرے (Siocan) میں مضمر دیکھ رہا ہے ، میں نے یہ کہیں نہیں کہا کہ کوئی نیشن کسی دوسری نیشن کے ہاتھوں مغلوب ہی نہیں ہو سکتی ۔ یہ تو تنازع للبقا اور بقائے اصلح کے قوانین فطرت کے ماتحت واقع ہونا لازم اور اٹل ہے لیکن اگر وہ محکوم ہونے پر اپنے نیشن ہونے کے دعوے سے دستبردار ہو جاتی ہے تو پھر یقیناً وہ نیشن نہ رہیگی ۔ وہ جلد یا بدیر اپنی حاکم نیشن کے اندر مدغم ہو جائیگی اور یا یہودیوں کی طرح تتر بتر ہو جائیگی ۔

ستم ہے کہ میرے دوست اصولی اور عملی حیثیتوں میں امتیاز نہیں کرتے ۔ اگر ایک قوم کسی اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد اس سے انحراف کرتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس نے کبھی اس اصول کو تسلیم ہی نہ کیا تھا ۔ یا یہ کہ اگر عمل اصول سے مختلف رہا ہے تو اسکے یہ معنی نہیں کہ "اصول" سرے سے موجود ہی نہ تھا ، اور پھر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ خواہ کوئی سا عمل ہو رہا ہو اسکے موافق و مخالف اصول وضع و استخراج ہو سکتے ہیں جیسے تاریکی کے عمل سے تاریکی کا اصول (موافق) اور پھر تاریکی کے عمل سے روشنی کا اصول (مخالف) وضع کرنا ۔

آخر میں میرے دوست متیقن ہیں کہ یورپ کی مطلق العنان اقوام و ممالک نے یہ اصول کہ کوئی نیشن کسی دوسری نیشن پر حکمران نہ ہو کہیں بھی تسلیم نہیں کیا ۔ کیا میں اپنے دوست سے پوچھ سکتا ہوں کہ ترکی سلطنت کے حصے بخرے کس بنا پر کیے گئے تھے ، اور مانٹی نیگرو ، سرویا ، بلغاریہ اور رومانیہ وغیرہ کی "اسٹیٹس" کا ظہور کس طرح وجود میں آیا تھا ؟ بلجیم اور سوئٹزرلینڈ کی خود مختاری اور آزادی کو قائم رکھنے کیلیے وہ کون سی اقوام تھیں جو آپس میں متعاہد ہوئی

تھیں؟ پولینڈ کے حق آزادی کا بار بار کن اقوام نے اعلان کیا تھا؟ حبشہ کی خود مختاری کو محفوظ رکھنے کا کس بین الاقوامی جمعیت نے بیڑا اٹھا رکھا تھا؟ اور وہ نو طاقتوں کا معاہدہ (Nine power Treaty) جسکے ذریعہ سے چین کی داخلی آزادی کی ضمانت دی گئی تھی کیا بلا تھی؟

اگر میرے دوست کی ان حوالوں سے بھی تسلی نہ ہوئی تو پھر میں ان سے کہونگا کہ وہ جنگِ عالم کے خاتمہ پر "پیس تھیوری" کے ماتحت مختلف ممالک کے مدبرین ومفکرین سیاسی کے ان بیانات کو پڑھیں جو بالخصوص امریکہ اور یورپ کے اخبارات میں شائع ہوتے رہے تھے۔

مسلمان

اور

موجودہ سیاسی کشمکش

اس کتاب میں ایڈیٹر ترجمان القرآن کے وہ سیاسی مضامین یکجا جمع کرکے شائع کیے گئے ھیں جو ترجمان القرآن کی اشاعتہائے سابقہ میں محرم ۱۳۵۶ھ سے رجب ۱۳۵۶ھ تک لکھے گئے تھے۔ یہ کتاب اصل میں اسلامی ہند کی گذشتہ تاریخ، موجودہ حالات، اور مستقبل کے امکانات پر ایک مدبرانہ تبصرہ ھے، جس سے مسلمانانِ ہند کے دل و دماغ میں ان کے قومی مسئلہ کا ایک نیا تصور پیدا ہوتا ھے۔ کوئی لکھا پڑھا مسلمان اس کے مطالعہ سے محروم نہ رہنا چاھئے۔ یہ کتاب اصل لاگت پر فروخت کی جا رھی ھے۔ ذیل کے نرخوں پر آپ اسے طلب فرما سکتے ھیں۔

ایک روپے میں	۵ نسخے	علاوہ محصول ڈاک	
نو روپے میں	۵۰ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار	
پندرہ روپے میں	۱۰۰ نسخے	کرایہ ریل بذمہ خریدار	

نوٹ: محصول ڈاک فی نسخہ سات پیسے ھے۔ ریلوے پارسل کے ذریعہ کم از کم ۲۵ نسخے منگوانے میں فائدہ رہتا ھے۔

شعبۂ اشاعت دارالاسلام (پٹھان کوٹ - پنجاب)

سہیل و تصاویر پرنٹ پریس ہال روڈ لاہور میں طبع ہوئے